ماہنامہ

اگست 2025ء

طلوعِ اسلام

لاہور

اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِی (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کرلیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہیے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)-

مذہب	دینِ اسلام
1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔	دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔
6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔	دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز	زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔	دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
اگست 2025ء

جلد 78 شمارہ نمبر 08

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: آزادی کے 78 سال	ادارہ	4
قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟	علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ	7
جشنِ آزادی؟	آصف جلیل، لاہور	30
مسجدِ اقصیٰ	علامہ عنایت اللہ اثری (مرحوم)	34
ملتِ اسلامیہ کا مقنن اعظم امام ابوحنیفہؒ	ادارہ	37
پیامِ فصلِ بہار (گذشتہ سے پیوستہ)	منزل بہ منزل	47

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
Cell: +92 318 2221851
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

آزادی کے 78 سال

اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ ؕ کَفٰی بِنَفۡسِکَ الۡیَوۡمَ عَلَیۡکَ حَسِیۡبًا ﴿ؕ۱۴﴾

(17:14)

حکیم الامت، علامہ اقبالؒ تاریخِ انسانی کے بالغ نظرانہ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ:

عالم بشری میں ایک ایسی امت قائم ہوسکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو.......
بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشائے الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پا جائے۔

نیز

عالم بشری (کے لئے)......سوائے نظامِ اسلامی کے کوئی اور واحد اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشری کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔

عالم بشری کے لئے قرآن پر مبنی واحد اجتماعی نظام کو بطور منزل سامنے رکھ کر آپ نے پہلا قدم اٹھایا اور ایک ایسے خطہ کے حصول پر زور دیا جو اس عالمگیر تجربے کے لئے بطور معمل کام دے سکے چنانچہ آپ نے ملت کے سامنے اس مملکت پاکستان کا تصور پیش کیا جس کا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں۔

انہوں نے یہ بھی واضح طور پر بتا دیا کہ:

اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے اور اسکی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا۔ لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

مسلمانان برصغیر کی جو تقدیر اقبال کے کارگہِ فکر سے نقش پذیر ہو کر نکلی تھی اس کے عملی حصول کے لئے جس تحریک کی ضرورت تھی اس کی قیادت کے لئے آپ کی نظر انتخاب قائداعظمؒ پر پڑی۔ چنانچہ مسلمانوں کی قسمت ان کے ہاتھ سونپنے سے پہلے انہیں آپ نے بتا دیا کہ

اس وقت حالت یہ ہے کہ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دوسو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو...... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جاسکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامان نشوونما دیا جا سکتا ہے۔

قائداعظمؒ بھی جنہیں اقبالؒ نے مسلمانوں کی قیادت کے لئے منتخب کیا اور جنہوں نے پاکستان حاصل کر کے دکھا دیا یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی نجات ایسے نظام معاشرت میں ہے جو قرآنی اصولوں پر موسس ہو۔ 1941ء میں آپ نے حیدرآباد میں فرمایا۔

میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی، یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

یہ تھے وہ محرکات جنہوں نے مسلمانوں کو دنیا بھر کی مخالفت کے علی الرغم اس موقف پر قائم کر دیا کہ مسلمان بہ حیثیت مسلمان ملت واحدہ ہے اور اسے اپنی معاشرت کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے ایک ایسے خطۂ ارض کی ضرورت ہے جو اجنبی اثرات سے یکسر پاک ہو اور جسے وہ آزادانہ قرآنی تعلیمات کا گہوارہ بنا سکیں۔ کتنی پاک تھیں یہ امنگیں اور کتنی حسین تھیں یہ آرزوئیں۔ شاید انہی کا صدقہ تھا کہ خلاف توقع اور دیکھتے دیکھتے کرۂ ارض کی سب سے بڑی اسلامی مملکت معرض وجود میں آ گئی۔ کتنی بڑی کامیابی تھی یہ! وہ قوم جو کوئی نوے سال پیشتر دولت وحشمت سے اس قدر محروم کر دی گئی تھی کہ اس کی زندگی تک معرض خطر میں پڑ گئی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اس امت کی اجل کا وقت آ پہنچا ہے وہی قوم ایک مملکت جدید کی مالک بن رہی تھی۔ ایسی مملکت کی مالک جس کی حیثیت تاریخ اسلام میں ایک دوسرے ''مدینہ'' کی تھی کہ یہاں وہ اپنے خوابوں کی تعبیر اور تصورات کی تشکیل بے روک ٹوک اور بلاخوف وخطر کر سکتے تھے۔

قائداعظم جو اس قوم کو ایک فرعون نہیں بلکہ متعدد فرعونوں کے چنگل سے نکال کر اس نئی دنیائے امن وسلامتی میں لے آئے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ چل بسے تو عجیب افراتفری کا دور شروع ہوا۔ اس گھر کی حالت بعینہٖ وہ ہوگئی جو ایک بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد ناخلف اولاد کے ہاتھوں ہو جایا کرتی ہے۔ نام نہاد آزادی کی زندگی کو دیکھا جائے تو پاکستان قرونِ وسطیٰ کا وہ دربار نظر آتا ہے، جس میں بادشاہ کے مر جانے کے بعد سازشوں کا جال بچھ گیا ہو۔ اقتدار کی اس کشمکش سے

خانہ جنگی کی وہ صورت پیدا ہوئی کہ مقاصد کی تکمیل تو ایک طرف سرے سے مملکت کی برقراری مخدوش نظر آنے لگی۔

حصول پاکستان کے بعد پہلا سوال یہ پیدا ہونا چاہئے تھا کہ جس قرآنی نظمِ معاشرت کے تجربے کے لئے اس خطۂ ارض کو حاصل کیا گیا ہے اس کا خاکہ کیا ہے اور اس میں کیسے رنگِ عمل بھرا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک تو اس منفرد ملک کی پیدائش ہی نے اس کے لئے ایسے گوناگوں خطرے پیدا کر دیئے کہ ان سے عہدہ برا ہونا آسان نہ تھا۔ دوسرے قائدین پاکستان اہم امور سے ہٹ کر ذاتی اقتدار کے حصول میں منہمک ہو گئے جس سے موانعاتِ راہ ناقابل عبور بن گئیں۔ چنانچہ آزادی کے انسٹھ سالوں میں ہمارے نام نہاد دستور سازوں نے مطلقاً یہ کوشش نہیں کی کہ اسلامی اصولوں کو ترتیب و متشکل کریں تاکہ ان کے مطابق مملکت کا دستور تیار کیا جاسکے۔ ان کا از خود نہ کرنا شاید اس لحاظ سے قابل فہم تھا کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے لیکن جو چیز بالکل ناقابل فہم اور ہر طرح ناقابل معافی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اقبالؒ کے اس مکتب فکر سے ذرا بھی استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی جو قرآنی اصولوں کی تشکیلِ نو میں مصروف تھا اور ہے۔ اس مکتب۔۔ یعنی طلوع اسلام۔۔ نے اسلامی نظام اور قرآنی دستور پاکستان کو اس وضاحت سے مرتب کر کے ان کے سامنے پیش کیا کہ اس کی مثال سارے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ اس بے مثل کاوش کے بے نظیر نتائج کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ گزشتہ 78 سال میں ہم قدم قدم پر مات کھاتے رہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نتیجہ ہے ہماری غلط روش زندگی کا اور یہ بھی کہ ہم جس آئیڈیالوجی کو لے کر چلے تھے اسے ہم نے کہیں بھی نہیں آزمایا۔ لہٰذا جہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اب تک ناکام ہوئے وہاں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ یہ ناکامی ہماری آئیڈیالوجی کی ناکامی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی ناکام نہیں ہوئی بلکہ ابھی اسے آزمایا ہی نہیں گیا تو اس آئیڈیالوجی کو اچھی طرح سمجھئے اور اسے عملاً زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ اور رائج کیجئے۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہماری آئیڈیالوجی بالکل محفوظ حالت میں قرآن میں موجود ہے۔ گویا ہم نے کچھ کھویا نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کو ضابطہ حیات بنائیں۔ اس کے لئے قومی عزم کی ضرورت ہے۔ ہم میں آج تک اس عزم کا فقدان رہا ہے۔ قومیں اس سے محروم ہو کر موت سے ہمکنار ہو جاتی ہیں اور جب اس دولت کو پالیتی ہیں تو ان کی موت زندگی سے بدل جاتی ہے۔

بہ حیثیت مسلمان، ہماری حیاتِ ملی کے لئے بنیادی اسباب میں سے دو ہی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک ہماری بے مثل و بے نظیر آئیڈیالوجی اور دوسرے وہ خطۂ زمین جس میں آئیڈیالوجی کو نافذ کیا جاسکے۔ ہماری آئیڈیالوجی (قرآن) تو شروع سے محفوظ چلا آرہا ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ خطۂ زمین جسے ہم نے اس کے لئے حاصل کیا وہ بھی ابھی تک محفوظ ہے۔ اگرچہ متعدد تخریبی قوتوں کا یہ عالم رہا اور اب تک ہے کہ (غالب سے معذرت کے ساتھ)

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را ''خواہم'' کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

یہ خطۂ زمین ہمارے پاس محفوظ ہے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ آج 14 اگست 2025ء نہیں بلکہ 14 اگست 1947ء ہے۔ لہٰذا اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر آپ صحیح خطوط پر کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نئے سرے سے آغاز کر دیجئے۔

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟

اسلام' ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہونے سے وہ' دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے' دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں' اور اس کا اصل الاصول' امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ ہمارے مروجہ تصورِ اسلام کی رو سے' اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم' غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم' انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج' بھارت کا مسلمان' بایں ہمہ بے بسی و بے کسی' انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لئے' اپنی حکومت کا قیام' لازمی شرط قرار دیتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ۔۔ (مفہوم) یہ وہ لوگ ہیں' (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا انصرام کریں گے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ (22:41) یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لئے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر' ہر حال میں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکن کیلئے استخلاف فی الارض ضروری ہے' کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔۔۔ يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا ط (24:55) جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپؐ کے پاس آیا اور اس دعوت کے مقاصد کے متعلق وضاحت چاہی۔ آپؐ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت' یعنی باغ و بہارِ آخرت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔۔ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ۔۔ نعم النصر و التمکین فی البلاد۔۔ اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہوگی۔ (الکامل)۔

اسلام کا تقاضا:

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا' جس کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش

کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔'' (خطبہ الہ آباد۔1930ء)۔

اس سے بھی پہلے، انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر رکھی تھی کہ:

''اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئت اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔''

اس مملکت میں، عبادت نام ہوتا ہے قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامت صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افراد معاشرہ، ان قوانین کا از خود، بہ طیب خاطر، اتباع کرتے جائیں اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افراد معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامان نشو و نما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

''اسلام، تخت و تاج سے وفا شعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہد وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔'' (خطبات)۔

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:

''اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (حیدر آباد دکن 1941ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہ جواز اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبۂ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ:

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ سب سے بڑی وجہ نزاع اور سب سے شدید سبب تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے۔ کہ: اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰۤی اٰثٰرِہِمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ (43:22)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ہم اسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آ رہا ہے۔ ہم انہی کے نقوش قدم کا اتباع کریں گے۔ ہم اپنی روایات کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے'۔ ان سے' اس کے جواب میں کہا

جاتا کہ اَوَلَوۡ جِئۡتُكُمۡ بِاَهۡدٰى مِمَّا وَجَدۡتُّمۡ عَلَيۡهِ اٰبَآءَكُمۡ ؕ (43:24)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ واجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو' تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظام نو کی ضرورت نہیں۔ حَسۡبُنَا مَا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ (5:104)۔۔ وہ مسلک ہمارے لئے ہر اعتبار سے کافی ہے'۔۔۔ یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظام جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلک آباء کی' اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لئے رسولؐ اللہ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ۔ وَلَا تَرۡكَنُوۡۤا اِلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا (11:113)۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا' تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ (11:113)۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا' ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریات حیات وتصورات زندگی' ان تمام روایات کہنہ اور مسالک قدیمہ کو الگ کر کے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آ رہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر۔۔ لا الٰہ الا اللہ۔۔ ہے۔ اس میں لا الٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصورات کو الگ کر کے' ہر شے کا ازسرنو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر' اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الا اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ۔

ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں ''بت پرستی'' کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لئے اوثان کا لفظ آیا ہے جو وثن کی جمع ہے اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود و تعطل' عدم حرکت' جامد وغیر متحرک ہو جانا۔۔ اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصور یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے وثن ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکت پیہم اور سعی مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ''حرکت پیہم'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ' قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک ذی حیات تحریک (Dynamic Movement) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے' اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآن کے اس عظیم نقطہ کو پس پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ چنانچہ ''وہائیٹ ہیڈ'' لکھتا ہے کہ:

''بت پرستی کی کنہ وحقیقت مروجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے۔'' (ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص:12)۔

اس قسم کی بت پرستی میں' ایک زندہ اور متحرک نظام حیات کے تصورات ومناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں' ان کے

معانی ومفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب' دین کی ممی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم' اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ:

''زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے......اس سے تہذیب وترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت غائب ہو جاتی ہے۔''

(ایڈونچر آف آئیڈیاز' ص:358)

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان' بلاسوچے سمجھے اور بلا اختیار وارادہ' اپنے اسلاف کے مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے' اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروان انسانیت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی' اپنے اسلاف کی طرح' غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھئے۔ جوہر زندگی کی نمود' اپنے اختیار وارادہ اور فکر وبصیرت سے' تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے' محض تقلیداً کئے جائیں' تو یہ انسانی زندگی میں نشوو ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (Moral) تو خیر بڑی چیز ہے' اس میں (Immoral) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (Amoral) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (Amoral) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لئے اقبال کہتا ہے کہ:

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید! — گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

(مفہوم: اپنے تیشہ سے خود اپنا راستہ تراشو۔ دوسروں کے بنے بنائے راستوں پر چلنا عذاب ہے۔ اگر تمہارے ہاتھوں کوئی نادر کام سرزد ہو جائے۔ وہ چاہے ''گناہ'' ہی کیوں نہ ہو پھر بھی ''ثواب'' ہے۔)

قرآن کریم نے' اپنا تعارف کراتے' یا یوں کہئے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۚ‌ۖ ① (97:1)۔ یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے اس کی آمد سے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوئی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو' جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے' ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ:

''اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔'' (خطبہ الٰہ آباد)۔

روشِ کہن: ہمارا مروجہ مذہب' ہماری شریعت' ہمارا کلچر' ہماری روایات' ہمارا فلسفۂ حیات' ہمارے رسوم ومناسک' غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں' عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبال نے اس کے لئے ''عجمی اسلام'' کی

اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عباسیہ) میں ہوا تھا' لیکن تھا عجم سے مستعار لئے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔ اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

شریعت' طریقت' تصوف' کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد' ان ''بتانِ عجم'' کو حریم کعبہ سے نکال کر' اسے خالصتہً ''خدا کے گھر'' میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں ''جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے'' اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت:

''بتانِ عجم'' کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت' اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوئی تھی۔ مذہبی پیشوائیت' ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لئے رکھنا چاہتی ہے کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ؎

حکایتِ قدِ آں یارِ دلنواز کنم بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

(مفہوم: اس دل نواز دوست کی طویل قامت کی دل کشی کا قصہ بیان کر رہا ہوں۔ اس بہانے اپنی عمر کو دراز کر رہا ہوں۔)

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافت راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اس نظام میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی' اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

قرآنی پاکستان میں زندگی کو ایک لوحِ سادہ (Clean Slate) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملت پاکستانیہ' حضور نبی اکرم ﷺ کے ان الفاظ گرامی کو پورے حزم و یقین اور کامل وثوق و اعتماد کے ساتھ' بانگ دہل دنیا کے سامنے دہرا سکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

الا۔ کل شئی من امر جاھلیت تحت قدمی موضوع۔

ہاں! زمانۂ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

قرآنی پاکستان' اس عظیم انقلابی اعلان کی نشر گاہ ہوتا۔ اسی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا۔ کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز:

قرآنی مملکت میں' حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا' بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:109) تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوع انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے' تقسیم عمل کے اصول کے مطابق' مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں' افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدّین' یعنی قرآنی نظام کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ط وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے' نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانین خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ (3:79) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبال کے الفاظ میں

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں' این است و بس

(مفہوم: اس دنیا میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہ ہو۔ شرعِ مبین (اسلام) کی تعلیمات بس اِسی نکتہ میں مرتکز ہیں۔)

جب عہدِ فاروقی میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے' تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ۔۔ مالنا ملك. بل لنا امیر۔ ہمارا بادشاہ کوئی نہیں' ہمارا صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہنمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت' جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے' اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے' اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر' صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں' ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:

"یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور' طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں اور ہر طاقتور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔"

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔ کہ:

"یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لئے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔"

خلافت اور ملوکیت میں فرق:

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے' بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افراد معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے اور

بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لئے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:

''لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانون خداوندی کے مطابق اور جو کچھ لوں، اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔''

اور یہ بھی کہا تھا کہ:

''تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔''

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افراد معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لئے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے۔۔۔ لہٰذا، مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک گرمی کا اور ایک سردی کا۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے اتنا کھانا جو قریش کے ایک عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں:

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (18:46) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک قُرَّةَ اَعْيُنٍ (25:74)۔۔ کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ (8:28)۔ یہ انسان کے لئے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصد حیات میں تمہارے سب سے بڑے دشمن اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (64:14) ''یاد رکھو! تمہاری اولاد اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں۔'' تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی کے ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقام بلند و رفیع سے گر کر چکنا چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی کو ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امور خلافت ان کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امور مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبیداللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لئے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کر لیں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ بیٹوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔

انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیر المومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لئے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپنے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا۔۔۔؟ آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمر کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہوگی تو سب پر اور کشادگی ہوگی تو سب کے لئے۔۔ انکا دستور تھا کہ:

''جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ اور لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔۔ اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس کی وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے) تمہیں ان سے دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔'' (تاریخ عمرؓ۔ ابن جوزی)

عدل:

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے۔ اور اس میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ اِنَّا جَعَلۡنٰکَ خَلِیۡفَۃً فِی الۡاَرۡضِ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الۡہَوٰی (38:26)۔ تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لئے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون، جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہوگا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر، خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطۂ قوانین

کو کہا جاتا ہے۔قرآن کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد، یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔جو مملکت، قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ (5:44)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی موثرات دخیلِ کار:

اس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکے گا۔نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا (2:48)۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔۔''اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔'' (55:41)اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں۔وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ (36:59) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے۔وَلَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ اِلَّا عَلَيۡهَا ۚ (6:164)۔اس میں ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق بدلہ پاتا ہے۔وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى ۚ (6:165)اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔اس باب میں، اور تو اور، خود حضور رسالتماب ﷺ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ:

اگر میں بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔(6:15)

اور اس کے بعد فرمادیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی۔۔فاطمہؓ۔۔بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہئے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو مدینہ بلوا کر، اسے ازسرِ نو پبلک میں سزا دی۔۔جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سماتا، کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق حاصل ہے۔خود حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ ایک عدالت

میں پیش ہونے کا اتفاق ہوا تو جج نے انہیں امتیازی مقام پر بیٹھنے کی پیشکش کی' آپ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا اور مدعی کے برابر بیٹھ گئے مقدمہ ختم ہونے کے بعد' آپ نے جج کو لکھا کہ تم جج بننے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک تم امیر المومنین اور ایک عام شہری کو یکساں نہ سمجھو۔

قرآنی مملکت میں یہ کیفیت تو عدالت کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں مناسب تعلیم و تربیت سے خود افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر ان سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو وہ خود اپنے آپ کو اپنے جرم کی سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کا کوئی اور شاہد ہو یا نہ ہو' خود خدا کا قانون مکافات عمل سب سے بڑا گواہ ہوتا ہے۔ وہ گواہ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

وہ نگاہ کی خیانت اور دل کے اندر گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہوتا ہے۔

(40:19)

یہی تھی وہ تعلیم جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک رات حضرت عمرؓ' حسبِ دستور' افراد معاشرہ کے حالات کا براہ راست مطالعہ کرنے کے لئے گشت کر رہے تھے کہ آپ نے سنا کہ ایک خیمہ کے اندر' ماں اپنی بیٹی سے کہہ رہی ہے کہ دودھ میں تھوڑا سا پانی ملا کر اسے چولہے پر چڑھا دو۔ بیٹی نے کہا کہ امی! میں دودھ میں پانی نہیں ڈالوں گی' کیوں کہ خلیفہ نے اس سے منع کیا ہے۔ ماں نے جواب دیا کہ پانی ڈال دو' خلیفہ اس وقت کہاں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ خلیفہ تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم خلیفہ نے ہم تک پہنچایا تھا۔

خلیفہ نے گھر آ کر بیوی سے کہا کہ صبح اس خیمہ میں جاؤ اور اس لڑکی کی ماں سے لڑکی کا رشتہ مانگ لو۔ ایسی بچی جس گھر میں آ جائے گی وہ گھر نور سے بھر جائے گا۔

پہل کہاں سے ہو؟:

لیکن افراد معاشرہ میں اس قسم کی تبدیلی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب پہلے برسر اقتدار طبقہ خود اپنے کیریکٹر میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرے۔ لوگ قانون کی اطاعت کرتے ہی اس وقت ہیں جب ان کے ارباب حل و عقد خود قانون کی اطاعت کریں۔ اسی طبقہ کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑتی ہے اور اسی کے سنورنے سے ساری قوم سنور جاتی ہے۔ جب حضرت صالحؑ کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا تو آپ نے دیکھا کہ قوم تمام کی تمام بگڑی ہوئی ہے' اس کی اصلاح کی صورت کیا ہوگی؟ تو خدا کی طرف سے جواب ملا کہ گھبرانے کی بات کوئی نہیں۔ وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (27:48) مملکت کے مرکز میں قوم کے نو سرغنے ہیں اور وہی سارے فساد کا موجب ہیں اور قوم کے معاملات کو سنورنے نہیں دیتے۔ اگر وہ راہ راست پر آ جائیں تو ساری قوم سنور جائے گی۔ یہی تھی وہ حقیقت جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں۔ جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے' رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے' رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآن کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا۔۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کر دے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا (18:28)۔ اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود سے تجاوز کر جائیں، تو اس کی اطاعت مت کرو۔

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:

اگر ایک ناک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو، تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ:

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ:

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لئے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے، تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعی اول۔۔ حضورؐ نبی اکرم نے خود فرما دیا کہ انا اول المسلمین۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت کے آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رو سے خود امیر مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا اور اگر وہ مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس:

یہ تھا عدل۔۔ یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ۔۔ اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں عدل عمرانی (Social Justice) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آج کل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی،

سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی بر عدل (Just) کہا جائے گا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق (یا واجب۔۔Due) کا تعین، پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (Valid Moral Principles) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظروں سے گذرا ہے، اس میں (Emil Brunner) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل (Just) اور فلاں ظلم پر مبنی (Unjust) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا۔ جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی مینا کاری اور ملمع سازی ہوگی۔
>
> (Justice and The Social Order)

رزق کا حق:

قرآن کی رو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ، ازروئے قوانین خداوندی حقدار ہے، عدل کہلائے گا اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے سوشل جسٹس کے معنی ہوں گے، ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت اس قسم کے سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے، ہر ذی حیات کے لئے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

> (مفہوم) سطح ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔(11:6).

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افراد معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ:

> (مفہوم) (تم مطمئن ہو کر بلند مقاصد حیات کے حصول کے لئے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔(6:152)۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہِ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے یا اشتراکی۔۔ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے تو بات

نکھر کر سامنے آ جاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں۔ سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پر لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے۔۔ یعنی تمام افراد معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامان زیست کی ذمہ داری۔۔ اسی کو ایتائے زکٰوۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوع انسانی کو سامانِ نشو ونما فراہم کرنا‘ اور‘ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے‘ یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ‘ زمین ہے اور قرآن کی رو سے‘ زمین پر۔۔ جو خدا کی طرف سے بلا مزدو معاوضہ‘ انسانوں کی پرورش کے لئے عطا ہوئی ہے۔۔ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10) قرار دیا ہے۔ یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا رہنا چاہئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلے جانا چاہئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد‘ جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع وعریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ۔۔ لنا رقاب الارض۔۔ زمین مملکت کی رہے گی۔

ربٰو کا مفہوم:

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد‘ سب سے اہم سوال‘ حصول دولت کا ہے۔ عصر حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (Labour) کا ہونا چاہئے یا سرمایہ (Capital) کا اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے اس سے ایسا نظر آتا ہے۔ گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے۔ حالانکہ ارباب فکر ونظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لئے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے۔۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (Commercial Interest) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے‘ ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس‘ ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (2:279) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسول (اسلامی نظام) کے خلاف اعلان جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظام مملکت کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا

ہے۔اس کی وجہ ظاہر ہے۔ربوٰ کے معنی ہیں ''سرمایہ پر بڑھوتی''۔۔(سودتواس کی صرف ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔لہٰذا' ربوٰ کا مرتکب' اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔اس لئے اسے ''خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔لہٰذا' قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے' حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا' سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)۔یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (Surplus Money) کی' جو نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے' کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دینے کا حکم دیا ہے۔وَيَسۡـئَلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ ؕ (2:219)''تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لئے کھلا رکھیں۔ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زیادہ ہے' سب کا سب۔''اسی کی تفسیر رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا ہے کہ:

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو۔اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔میں نے کہا۔یا رسولؐ اللہ! یہ کیسے ممکن ہے۔آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔(حاکم)

دولت کی تقسیم:

کمیونزم کا سنگ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے:

From each according to his capacity's to each according to his needs.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔۔جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں' سوشلزم کا نظام رائج ہے۔اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔اس میں شروع میں مال غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسولؐ اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادہ شدہ کو دگنا حصہ' کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔اس کے بعد جب افراد مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کار فرما رکھا گیا۔یہ اس لئے کہ تمام افراد معاشرہ کو رزق۔۔یعنی سامان زیست۔۔مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا' جس میں

کیفیت یہ ہو کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِيۡهَا وَلَا تَعۡرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَلَا تَضۡحٰى ﴿۱۱۹﴾ (20:118-119)۔۔نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامان آسائش وزیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَلِبَاسُهُمۡ فِيۡهَا حَرِيۡرٌ (22:23) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات ثِيَابًا خُضۡرًا مِّنۡ سُنۡدُسٍ وَّاِسۡتَبۡرَقٍ (18:31)۔۔دبیز ولطیف ریشم کے زرکار پردے سور موضوفۃ مرصع اور نرم ونازک صوفے بِاٰنِيَةٍ مِّنۡ فِضَّةٍ وَّاَكۡوَابٍ كَانَتۡ قَوَارِيۡرَا۠ (76:15) چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔غرضیکہ۔۔ نَعِيۡمًا وَّمُلۡكًا كَبِيۡرًا (76:20) عظیم مملکت اور اس میں سامان آسائش نہایت فراواں۔اور پھر یہ سامان آسائش وآرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فرد معاشرہ کے لئے یکساں۔قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائیے۔اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں۔ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔اس میں سب کا معیار زندگی اتنا بلند ہوگا۔جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ ان کے اولین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فسادانگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔۔اور نکبت وافلاس سے پستی ودنائت کے انسانیت کش عیوب وزمائم۔جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراط زر ہوگا نہ افلاس وزبوں حالی' تو ظاہر ہے کہ اس میں' ان سے پیدا ہونے والے عیوب وذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔۔حسد' کینہ' انتقام' تنگ نظری' حرص' ہوس' فریب کاریاں' مکاریاں' سازشیں۔۔اور دوسری طرف بے حمیتی' بے غیرتی' ذلت نفس' تملق' خوشامد' منافقت وغیرہ' یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان' وجہِ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا وَّلَا تَاۡثِيۡمًا ﴿۲۵﴾ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے' نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو اِلَّا قِيۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ (56:25-26) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشید دلنواز وآہنگ جاں افروز سنائی دیتی ہے۔وَنَزَعۡنَا مَا فِىۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ (7:43) ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان' غلط معاشرہ میں' دل میں چھپائے رکھتا ہے۔اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔تکریم انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔اس معاشرہ کا اندازہ وہ ہوگا جس کا نقشہ اقبال نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ۔

ساکنانش در سخن شیریں چونوش　　خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش
فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب　　رازدانِ کیمیائے آفتاب

کس ز دینار و درم آگاہ نیست | ایں بُتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر | کارہا را کس نمی سنجد بزر
سخت کَش دہقاں چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کِشت و کارش بے نزاعِ آبجو! | حاصلش بے شرکتِ غیرے ازو!!
اندراں عالم نہ لشکر نہ قشوں | نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مَرغدیں گیرد فروغ | از فنِ تحریر و تشہیر و دروغ
نے بہ بازاراں ز بے کاراں خروش! | نے صداہائے گدایاں دردِ گوش!

(مفہوم: اس کے رہنے والے شیریں گفتار ایسے جیسے ان کی باتیں شربت کی طرح میٹھی ہوں۔ وہ لوگ حسین وجمیل، نرم خصلت والے اور سادہ لباس پہننے والے تھے/ ہیں۔ ان کی سوچ حصولِ اشیاء کے سلسلے میں کسی دکھ درد کی حامل نہیں۔ وہ سورج کے کیمیا کے رازوں سے واقف ہیں۔ جس کسی کو سونے چاندی کی خواہش ہوتی ہے وہ سورج کی روشنی سے حاصل کر لیتا ہے، جیسے ہم شور پانی سے نمک حاصل کرتے ہیں۔ یہاں علم و ہنر کا مقصد دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ لوگ کام کو زر (دولت) میں نہیں تولتے۔ یہاں کوئی شخص دینار اور درہم (کرنسی کے نظام) سے واقف نہیں ہے۔ وہاں کے حرم (کعبہ) میں ان بتوں (دینار و درہم) کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں کا کسان جفاکش ہے اور اس کے گھر میں چراغ روشن ہے۔ وہ زمینداروں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے ظلم سے محفوظ ہے۔ ان کی کاشتکاری میں ندی کے پانی کے جھگڑے نہیں ہوتے اور فصل کسی کی شرکت کے بغیر اس کی اپنی ہے۔ پیداوار میں کوئی اور حصے دار نہیں۔ اس جہاں میں تو کوئی لشکر ہے اور نہ کوئی فوج ہے اور نہ یہاں کوئی دوسروں کا خون بہا کر روزی کماتا ہے۔ مرغدین میں فن تحریر اور جھوٹی شہرت کی خاطر قلم کو کوئی فروغ حاصل نہیں ہے۔ نہ تو یہاں کے بازاروں میں بے کاروں کی نعرہ بازی ہے اور نہ بھکاریوں کی کانوں کو دکھ پہنچانے والی آوازیں ہیں۔)

آخر میں اقبالؒ نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس در آں جا سائل و محروم نیست | عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

(مفہوم: یہاں نہ تو کوئی سائل ہے اور نہ کوئی محروم ہے۔ یہاں نہ کوئی غلام ہے، نہ کوئی آقا ہے، نہ کوئی حاکم ہے اور نہ کوئی محکوم ہے۔)

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ (21:92) اور پر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیب گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو

محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء، خود اربابِ نظم و نسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ:

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں ہوں۔۔ خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد گرامی کہ

جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حسن و خوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عُمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد اُمت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ، اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ انہیں ولائیت کوفہ کے لئے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی، جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے۔ آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ آپ کا بیٹا۔۔ عبداللہ۔۔ یہ سن کر انہوں نے کہا کہ قاتلک اللہ۔ خدا تجھے غارت کرے۔ تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً لکھتے رہتے تھے کہ:

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو، سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے، کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا ہی۔ یہ عدم تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد، زراندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو

سکتا۔اس میں، تمام افرادِمملکت اوران کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔اس لئے کسی کواس کی فکر ہی نہیں ہوتی، کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔لہٰذا، اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔اسے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے:

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اول میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے کہ وہ کون سے اسباب واحساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدانِ جنگ سے بھاگ جاتا یا کمزوری دکھاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے۔کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔وہ زندہ رہتا ہے۔بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے۔(اسی لئے ہمارے ہاں موت کے لئے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا)۔۔مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور، ایمان کی حیثیت لئے ہوتا ہے۔اس لئے اسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔لہٰذا، اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو۔اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد، اس کے زور بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔اس کی تو نگاہ سے (اقبال کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے، تو وہ جن بن جاتا ہے۔اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ۔۔(Mill-Stone) کے نیچے بری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح ابھر کر باہر آتی ہیں، کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے۔اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے، محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان، کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔یہی وجہ ہے جو قرآن کریم نے حضرات انبیاءؑ سے کہا کہ:

(مفہوم) اے ہمارے رسولو! خوش گوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔(23:51)

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا، تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔اس نے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدم جس جنت میں رہتا تھا، وہاں اسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) وہ جہاں سے جی چاہتا،

پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے' تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ (20:117) وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا' جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ (20:123) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لئے' آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم ﷺ کا مقصد: قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ (7:157)۔ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا' جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی' اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل' وہ خوف و ہراس تھا جو ''روحانی قوتوں'' کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (Complexes) پیدا ہوتی تھیں' ہماری علمی دنیا اب ان سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختم نبوت کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ انا بشر مثلکم اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر' یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے' انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار' شرف انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے ارباب فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے' اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگایئے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو' اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اس نے نفی میں جواب دیا' تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے' اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے' کبھی سر جھکاتے اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے کہا کہ ''چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے۔'' اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار' اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے' انسانیت کے ماپنے

کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رو سے ملا تھا۔

نہ خوف نہ حزن:

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بری طرح کچل رکھا تھا' چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے' اس محبوس قفس طائر لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اِذن بال کشائی دے دیا جس سے اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآن کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افراد معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴿۶۲﴾ (10:62) ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے' اس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا' جس میں حالت یہ ہوگی کہ یمن سے ایک عورت تنہا' صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی' اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زیر دستوں کو بالا دستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے' سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لائیے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکا یک سواری کو روکا۔ نیچے اترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا' اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کی خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے۔ یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا کہ میں بے اختیار بحضور رب العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے' قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں' خدا اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے۔ اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس' جو قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے' پاؤں پھلسنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حزن' تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لئے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط (35:34) کس قدر قابل حمد و ستائش خدا (کا وہ نظام) جس نے ہمیں حزن سے نجات دلائی۔

عربی زبان کے مستند لغت' تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح وشام کے کھانے کی فکر۔۔اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کردی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ الَّذِیۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَۃِ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیۡہَا لُغُوۡبٌ ﴿۳۵﴾ (35:35) وہ خدا جس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کردیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے' نہ ذہنی کاوش ونفسیاتی افسردگی' نہ اس میں روٹی کے لئے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خواہ مخواہ پریشان رہے۔۔فکر معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی' یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات وحسنات۔

قرآن کریم (میں سورۂ فاتحہ) کی ابتداء اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ (1:1) سے ہوتی ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخور حمد وستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے رب الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوع انسانی کو سامان نشوونما بہم پہنچانے والا۔۔جیسا کہ شروع میں بتایا جاچکا ہے' انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔یہ مملکت بھی اسی لئے مستحقِ حمد وستائش ہوتی ہے کہ یہ افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحق تعریف وتوصیف قرار نہیں پاسکتی۔یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے ارباب بست وکشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروف تگ وتاز رہتے ہیں۔وہ سزاوار حمد وستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کرکے دکھائیں۔

ان کے برعکس' دوسرے ارباب اقتدار کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وَّ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ یُّحۡمَدُوۡا بِمَا لَمۡ یَفۡعَلُوۡا (3:187) ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔اس میں یہ لوگ سب کچھ کرکے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے' تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوۡرًا (76:9)۔ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف' شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے ''امام مہدی'' کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھوکر رہ گیا' ورنہ (اگر وہ روایات صحیح ہیں تو) نبی اکرمؐ نے' ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا' نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات۔آپ نے اس سربراہ مملکت اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ یقسم المال صحیحاً وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا۔کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔آپ نے فرمایا کہ۔۔بالسویۃ بین الناس۔۔تسویہ کے معنی ہوتے ہیں' کسی شے میں ہر قوت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔السوی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط وتفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو۔استوی الرجل۔۔کے معنی ہیں' اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔لہٰذا مال کی تقسیم

تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا اس لئے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ عام میں کہا تھا کہ:

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اول تو تمہیں کسی بات کے لئے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے' اس کا ازالہ ہو چکا ہو۔ یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لئے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لئے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبالؔ) نے' یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد　　مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان' اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا۔۔

لیکن

اور یہ ''لیکن'' ایک داستان ہے جگر گداز' اور ایک حدیث ہے دلخراش۔۔ اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ　　لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے' اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت نمبر 175 سامنے لائیے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ:

وَاتۡلُ عَلَيۡهِمۡ نَبَاَ الَّذِىۡۤ اٰتَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا (7:175)

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے تمام نشانات راہ عطا کر دیئے تھے۔ لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اسکی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے اکساؤ اور دوڑاؤ' تو بھی وہ ہانپے اور زبان لٹکائے اور ویسے چھوڑ دو تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ذٰلِكَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ (7:176) یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ (7:176) تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ' شاید یہ اس پر غور و فکر کریں اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔ سَآءَ مَثَلَا ۨالۡقَوۡمُ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا (7:177) اف! کس قدر بری حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم و زیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ وَاَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ (7:177) وہ اس طرح کسی دوسرے کا نہیں' خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا ۚ (7:179) وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا ۚ (7:179) وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ (7:179) ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا اُولٰۤـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ (7:179) تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں۔۔ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ ؕ (7:179) نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گزرے ہیں اُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ (7:179) حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا' اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا | مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

آصف جلیل، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جشن آزادی؟

14 اگست کو یوم آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سرکاری اداروں کے علاوہ گھروں پر بھی قومی پرچم لہرایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی گاڑیوں پر بھی جھنڈا، اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ ہم کچھ الگ ہیں۔ غریب بھی اپنے رکشہ پر یا بائک پر چھوٹے چھوٹے حسب استطاعت پرچم لہراتے جا رہے ہوتے ہیں۔ دوسری تمام رسموں کی طرح بہت کم ہیں جو اس بات کا جواب دے سکیں کہ یہ جشن کیوں منایا جا رہا ہے۔ اتنی بات تو شاید بتا دیں کہ 14 اگست کو پاکستان بنا تھا لیکن کیوں بنا؟ آزادی کسے کہتے ہیں؟ آزادی کیوں ضروری ہے؟ ان سوالات کے جوابات تو ہمارے دانشور بھی ابھی تک تلاش کر رہے ہیں۔

ساری رسمیں بیکار نہیں ہوتیں اگر لوگ انہیں منانے کا مقصد جانتے ہوں لیکن زیادہ تر وہ رسمیں ہیں جو بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کو دیکھ کر منائی جاتی ہیں یا اس لئے کہ سالہا سال سے ایسا ہو رہا ہے یا یہ کہ سب مناتے ہیں۔ بعض اوقات تو بالکل برعکس ہوتی ہیں اور خاص طور پر مذہبی رسومات جن کا تعلق کہیں نہ کہیں کھانے پینے اور اس سے جڑے کاروبار سے ہوتا ہے۔ ان سے بچ کر کم از کم اپنی محنت کی کمائی تو بچائی جا سکتی ہے لیکن معاشرے کا ڈر اور برادری کی طعنہ زنی کا خوف انہیں چھوڑنے سے روکتا ہے۔

14 اگست کی آزادی کے بارے مختلف آراء کے باوجود یہ بات متفق علیہ ہے کہ اس دن برصغیر دو ملکوں میں تقسیم ہو گیا۔ پاکستان اور ہندوستان۔ 1971 میں ایک اور ملک کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہوا کہ ہم کیا کرنے میں آزاد ہیں؟ کیا انگریزوں کے دور میں زیادہ آزادی تھی یا ان کے جانے کے بعد؟ کیا ان کے جانے سے واقعی نظام میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے؟

بہت سے مقاصد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اسلامی مملکت کے قیام کے لئے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ اس کے لئے ایک خطہ ارض کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جہاں بھی اسلام کا نام آئے ہمارے مذہبی راہنما میدان میں آ جاتے ہیں اور لگتا ہے انہوں نے اسلام کے جملہ حقوق اپنا نام کرا رکھے ہیں۔ ان کی اکثریت کے مطابق اسلام کے نفاذ کے لئے الگ خطہ ارض کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے نزدیک اسلام محض پانچ ارکان کا نام ہے جو کسی بھی ملک یا جگہ پر ادا کئے جا سکتے ہیں۔ انہیں قرآن کریم میں کہیں مملکت کا تصور نظر ہی نہیں آتا۔ بہر حال قائداعظم محمد علی جناحؒ جو ان کے مطابق مسلمان کے معیار پر پورے نہیں اترتے، انہوں نے علیحدہ ملک حاصل کرنے کی جدوجہد پاکستان بننے تک جاری رکھی۔ مروجہ اسلام کے مقابلہ میں میرے استاد محترم علامہ غلام احمد پرویز رحمہ اللہ نے قرآن کا موقف بیان کرتے ہوئے قائداعظم کے ساتھ

ساتھ اپنی بساط کے مطابق (گورنمنٹ ملازم ہونے کی وجہ سے ''آزاد'' نہیں تھے) کام کرتے ہوئے اس محاذ پر مذہبی راہنماؤں کے مقابلے میں مسلسل قرآن کریم کی آواز بلند کی جس کی شہادت ماہنامہ طلوع اسلام کے شماروں میں محفوظ ہے۔

آخر کار 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ اور چند ایک کے سوا سارے مذہبی راہنما عملاً اپنے ہی اسلام کے خلاف عمل کرتے ہوئے پاکستان تشریف لے آئے تاکہ یہاں پر اسلام کے حقوق اپنے نام کر لیں۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ سب جانتے ہیں کہ قائداعظم کی وفات کے فوراً بعد سے اس ملک نے اپنے عروج کی کم اور زوال کی زیادہ داستان مرتب کی جس کے لئے کروڑوں صفحات کم پڑ جائیں گے۔ آج جہاں تک ہم پہنچے ہیں اس سے سب باخبر ہیں۔

اب بات ہو جائے آزادی کی۔ اللہ تعالیٰ نے آزادی کی جو حدود متعین کی ہیں ان کی طرف میں آخر میں آؤں گا۔ فی الحال یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو نظرانداز کرتے ہوئے جب انسان اپنے عقل و فراست سے کام لیتا ہے تو وہ کس حد تک آزادی دینے کو تیار ہوتا ہے؟

ایک انسان کو کسی بھی وجہ سے دوسرے انسان/ انسانوں پر کسی قسم کا غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ حسب استطاعت اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ وہ دوسروں کی آزادی کو چھین لے۔ اس کی ابتدا گھرانوں سے شروع ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا بچہ جو نت نئے تجربات کرنا چاہتا ہے، والدین اپنا فریضہ سمجھتے ہیں کہ اسے ہر طرح سے بے بس کر دیا جائے۔ صرف اپنے آرام کی خاطر اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے سے پہلے دبا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تربیت کے نام پر اس کی پٹائی اور جسمانی سزائیں دے کہ اس کی ذات کو مجروح کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو بہت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔

جہاں مشترکہ خاندان کا نظام ہوتا ہے وہاں کے بڑے بوڑھے بچوں کے پَر کاٹنے میں مصروف ہوتے ہیں اور بچیوں کے لئے مختلف ناموں کے پنجرے ہوتے ہیں جن میں ان کو قید رکھا جاتا ہے۔ یہیں بے جوڑ شادیوں کے فیصلے ہوتے ہیں جن کی حکم عدولی کے سنگین نتائج نکلنے کی دھمکی بھی دی جاتی ہے۔ پھر ایسی شادیوں کا جو انجام ہوتا ہے اس کی کسے پرواہ ہوتی ہے۔ اگر بچے ہو جائیں تو ان کے لئے دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کہیں کام کر رہے ہوں تو آپ کے افسران آپ پر متعدد پابندیاں لگا کر رکھتے ہیں اور آپ ملازمت کے چھن جانے کے خوف سے اپنی آزادی کو گروی رکھ دیتے ہیں۔

ایک ملک میں جہاں بظاہر جمہوریت کا نام لیا جاتا ہے اور بنیادی حقوق کا چرچا کیا جاتا ہے وہاں ایسے ایسے قوانین بنتے ہیں کہ تلاش کے باوجود حقوق کہیں نظر نہیں آتے سوائے آئین میں تحریر کی شکل میں۔ عملاً پابندیوں میں جکڑے ہوئے عوام نہ شکایت کر سکتے ہیں نہ فریاد۔ اظہارِ خیال نہ تحریر کے ذریعے ہو سکتا ہے نہ تقریر کے ذریعے۔ سب اچھا ہے کہنا پڑتا ہے ورنہ انجام برا ہوتا ہے۔ ملکی دولت کا مصرف حکمران طبقے اور ان کے شخصی غلاموں پر بے دریغ خرچ کرنا ہوتا ہے اور عوام ٹیکسوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

کرۂ ارض کی طرف نظر دوڑائیں تو اس طاقت کے بل پر قبضہ کر کے بہت سے ممالک قائم کئے گئے۔ وہاں کے رہنے

والوں کو غلام بنا کر ذرائع پیداوار کی آمدنی اپنے ملکوں کی تعمیر میں لگانے کے بعد جب جی بھر گیا تو غلاموں کو آزادی مل گئی۔ لیکن اصل میں غیروں کی غلامی سے نکل کر اپنوں کے غلام بن گئے۔آزادی کا مطلب آقاؤں کا تبدیل ہو جانا ہو گیا ہے۔

پھر چند طاقتور ملکوں نے چھوٹے ملکوں پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لئے نئے نئے جال بنے، خوشحالی کی آس میں لئے گئے قرضوں نے بدحالی کے گڑھے میں پھینک دیا جو وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔

کچھ طاقتور ممالک نے اپنے عوام کو تھوڑی بہت آزادی کی جھلک دکھائی اور کچھ آسائشیں بھی مہیا کیں جس سے وہ خوش ہو گئے۔جن کے بس میں ہوا وہ انکی بظاہر خوشحالی کے حصول کی خاطر اپنے ملک چھوڑ کر ان ممالک میں جا بسے ہیں اور جن کے پاس وسائل نہیں ہیں وہ ہر ممکنہ طریقے سے ان کے پیچھے پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔کئی کشتیوں میں جاتے ہوئے ڈوب گئے یا کنٹینروں میں سفر کرتے ہوئے اگلے جہاں پہنچ گئے۔یہ بے چینی، یہ مشکلات جن سے نکلنے کا راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔ویسے تو غور و فکر کیا جائے تو کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آتی ہے مگر جب قوم کی اکثریت نے عقل سے کام لینا چھوڑ رکھا ہو تو وہ اس نظام کی دلدل میں مزید دھنستے جاتے ہیں۔اپنا راستہ بدلنے کو تیار نہیں ہیں نہ اپنا طریقہ کار۔ایک غلط کام مسلسل کرنے سے صحیح نتائج پیدا نہیں کرتا۔اپنا طریقہ کار بدلنا ضروری ہوتا ہے۔

اگر کسی کے گھر میں ایک روشن چراغ موجود ہو لیکن وہ اس کا استعمال نہ کرے محض اس لئے کہ ہمارے آباءواجداد تو یہ مدھم سا دیا استعمال کرتے تھے۔یا یہ کہے کہ ہمارے دادا کے گھر بجلی نہیں تھی اس لئے ہم بجلی نہیں لگوائیں گے۔یہ تو شاید نصف صدی پرانی بات ہو اور دوسرے لوگوں کے گھروں کو روشن دیکھ کر شاید اپنا رویہ بدل لیں مگر یہ کیا سوچ ہے کہ ہم اپنی صدیوں پرانی روایات اور سنی سنائی باتوں کو چھوڑ کر کسی اور حل پر عمل کر کے دیکھیں گے بھی نہیں۔ظاہر ہے کہ اس طرح تو حالات کبھی بھی نہیں بدلیں گے۔

بعینہ یہ طرز عمل مسلمانوں کی اکثریت کا ہے جو انہوں نے کتاب اللہ، قرآن کریم کے ساتھ اپنا رکھا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نور کہا ہے۔کوئی بھی اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے اس سے رجوع نہیں کرتا بلکہ آباءواجداد کے بتائے ہوئے مذہب پر چلنا پسند کرتا ہے۔اللہ کی ہدایت سے تو ہر مسئلے کا حل نکلتا ہے آزمائش شرط ہے۔سردست آزادی کے بارے میں قرآنی نقطہء نظر دیکھتے ہیں۔اللہ نے انسان کو اس حد تک آزادی دے رکھی ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس کی ہدایت پر عمل کرے اور چاہے تو اس کے خلاف عمل کرے۔اس سے قبل جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب اس بات کی شہادت ہے کہ انسانوں نے اللہ کی ہدایت کو چھوڑ رکھا ہے۔انسانوں کے دیئے ہوئے نظام میں بہت کم اچھائی نظر آتی ہے لیکن طاقت کے نشے میں ایک انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ ظلم کرنے میں کس حد تک جا سکتا ہے اس کے لئے فلسطینی عوام کے ساتھ ہونے والا سلوک اور پاکستان میں ہونے والے واقعات اظہر من الشمس ہیں اگر غور کیا جائے تو۔

اللہ تعالیٰ نے مادر پدر آزادی تو نہیں دی بلکہ اس کے لئے حدود مقرر کی ہیں۔اس آزادی میں تمام انسانوں کا مفاد ہے۔

لیکن جب ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دی جائے تو پھر اس کا لازمی نتیجہ ظلم ہے۔اس آزادی کو حدود فراموش ہونے سے بچانے کے لئے اس نے مملکت کی ذمہ داری لگائی ہے کہ آزادی کو حدود اللہ سے باہر نہ جانے دیا جائے۔اس میں عمر، زبان، قوم، ملک سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہر شخص قابل عزت ہے چاہے وہ بچہ بھی کیوں نہ ہو۔یعنی کسی کی تذلیل کرنا جرم قرار پائے گا۔کوئی شخص کسی دوسرے سے زبردستی یا طاقت کے بل پر کوئی کام نہیں لے سکتا۔ یہ کتنی بڑی آزادی ہے اگر اسے قانونی تحفظ حاصل ہو۔اس میں ہر طرح کی غلامی کا خاتمہ اور اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے کام کیا جاسکتا ہے۔نہ بچوں سے جبراً کام لیا جاسکتا ہے نہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر۔اللہ کی زمین پر ہر انسان، بلکہ ہر جاندار کا حق ہے۔اس پر صرف طاقت کے بل بوتے پر ایک اقلیت قابض ہے چاہے حکومتوں کی سطح پر ہو یا مملکت کے اندر۔ یہ وہ آزادی ہے جو حدود اللہ سے تجاوز کرکے حاصل کی گئی ہے۔ازدواجی زندگی کے لئے عورت مرد کو مکمل آزادی ہے کہ وہ باہم رضامندی سے شادی کرسکیں۔اس میں کوئی بھی دخل اندازی نہیں کرسکتا۔اس کی خلاف ورزی کے واقعات بہت عام ہیں۔

قرآن کی آزادی کی عملی مثالیں تو نظر نہیں آتیں البتہ اس کی خلاف ورزی سے انہیں سمجھا جاسکتا ہے۔معاشرے میں بے شمار کام ہیں جو جبراً کرائے جاتے ہیں۔مراتب میں فرق۔نااہلوں کو ذمہ داریاں سونپ دینا۔جرائم میں ملوث کرنا۔قتل وغارت،عورتوں پر مظالم اور ان کی عزتیں غیر محفوظ۔دولت کی غیر منصفانہ تقسیم۔بڑوں کا چھوٹوں پر رعب اور تذلیل (عمر یا عہدے کے لحاظ سے)۔ایک طویل فہرست میں سے یہ چند مثالیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آزادی کی جو حدود متعین کی ہیں ان کے تحفظ کے لئے قرآن کریم پر مبنی ایک مملکت کا ہونا لازمی ہے ورنہ انسانوں کی حکومتوں میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے وہ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ اعمال کے نتائج اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے مطابق نکلتے ہیں۔ان سے ہرگز مفر نہیں ہے۔لہٰذا سب کا مشترکہ مفاد اسی میں ہے کہ اسلامی مملکت کے قیام میں اپنا حصہ ڈالے۔اس کے لئے سب سے پہلے قرآن کو سوچ سمجھ کر پڑھنا ہوگا اور ان اقدار کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا ہوگا جن پر بغیر کسی مملکت کے انفرادی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے۔اور ساتھ ساتھ مملکت کے قیام کے لئے ایک مرکز پر اکٹھا ہونا ہوگا۔اس وقت ادارہ طلوع اسلام ہی وہ واحد پلیٹ فارم ہے جو نہ صرف قرآن کریم سمجھنے کے لئے ہر طرح کا مواد مہیا کرتا ہے اور اس کی باقاعدہ تنظیم بھی ہے جس کے ماتحت رہ کر اور دوسرے احباب کے ساتھ ملکر قرآن کی تعلیمات کو دوسروں تک احسن طریق سے پہنچانے کا کام کیا جاتا ہے جو مملکت کے قیام کے لئے بنیادی شرط ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کا قیام اسی سرزمین پر ممکن ہوتا ہے جہاں اپنا اختیار ہو۔ پاکستان کے حصول کا سب سے اہم مقصد یہی تھا جسے اب متنازع بنا دیا گیا ہے اور قرآن پر مبنی مملکت کے پروگرام کو پس پشت ڈال دیا گیا جس کی وجہ سے یہ ملک مسائلستان بن چکا ہے۔ اور اب مسلسل کوششوں سے ہی اس کے اصل مقصد کا حصول ممکن ہے۔ورنہ وہی ہوگا جو ہو رہا ہے بلکہ بد سے بدتر ہوتا جائے گا۔

علامہ عنایت اللہ اثری (مرحوم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مسجدِ اقصیٰ

سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا ۔۔۔(17:1)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کو لے گئی۔

اس آیت میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق واقعہ معراج سے ہے۔ جب حضور ﷺ پہلے مکہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے آسمانوں کی سیر فرمائی۔

پرویز مرحوم نے مفہوم القرآن میں لکھا کہ یہ درحقیقت واقعہ ہجرت کا بیان ہے اور اس میں مسجدِ اقصیٰ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس پر (حسب عادت) شور مچا دیا گیا اور اس کے خلاف دلیل یہ دی گئی کہ یہ بالکل نئی بات ہے۔ اس سے پہلے کسی نے ایسا نہیں کہا۔

جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے متقدمین میں سے (غالباً) کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ لیکن یہ دلیل ہی بے معنی ہے۔ صحیح بات صحیح ہے خواہ وہ پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ کہی گئی ہو اور غلط بات غلط ہے۔ خواہ اسے ہزار بار کیوں نہ دہرایا گیا ہو (اس کے بعد ''شاہکار رسالت'' میں موجودہ مسجدِ اقصیٰ کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی تھی)۔

اگلے دنوں ایک صاحب کی وساطت سے مولانا عنایت اللہ اثری (وزیر آبادی۔ ثم گجراتی) کی کتاب 'حصولِ تیسیر البیان (علیٰ) اصولِ تفسیر القرآن' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر (حیرت اور) خوشی ہوئی کہ اس میں انہوں نے اس آیت میں مسجد اقصیٰ کا وہی مفہوم لیا ہے جسے مفہوم القرآن میں لکھا گیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مولانا صاحب فرقہ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم تھے۔ ایک اہل حدیث عالم کی طرف سے اس آیت کا وہ مفہوم جو روایاتی مفہوم سے ہٹا ہوا ہو، واقعی باعثِ تعجب اور اس لئے وجۂ حیرت ہے۔ ان کی تحقیق کے ضروری مقامات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

حصولِ تیسیر البیان (علیٰ)
اصولِ تفسیر القرآن:

(از مولانا عنایت اللہ اثری، وزیر آبادی، گجرات، شائع کردہ اپریل 1955ء)۔

''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ ۔۔۔ عَبۡدًا شَکُوۡرًا ﴿۳﴾ (بنی اسرائیل 17

اللہ رحمٰن و رحیم کا نام لے کر پڑھو۔ چرچا کرو (اور) وعدہ خلافیوں اور غلط پیشگوئیوں سے اسے خوب پاک اور صاف بیان کرو تا کہ وہ اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد حرام سے (جو کہ اس کی جائے سکونت ہے) اس مسجد کی طرف کسی نہ کسی رات روانہ کردے گا جو کہ یہاں سے بہت دور ہے اور کہ تبلیغ و اشاعت کی وجہ سے اس کے اردگرد بہت سے سعید الفطرت لوگ مسلمان ہو کر اسلامی انوار و برکات سے متمتع ہو رہے ہیں اور حلقۂ اسلام دن بدن وسیع ہوتا جارہا ہے اور اس لئے اسے یہاں سے روانہ کیا جارہا ہے کہ اس کے توسط سے اب تک ہماری وہ آئتیں جو کہ پیش گوئیوں سے متعلق شائع ہوتی رہی ہیں کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور اس کے مخالف سب ناکام ہوں گے۔ ہم انہیں صاف طور پر پورا کر کے دکھا دیں اور مخالفوں کی طرف سے جو یہ اعتراض ہوتا رہا ہے کہ فلاں فلاں پیشگوئی پوری نہیں ہوئی۔ اسے اللہ پاک سنتا رہا ہے اور جو کسی پیشگوئی کے خلاف انہوں نے قدم اٹھایا تا کہ وہ پوری نہ ہو سکے۔ اسے اللہ دیکھتا رہا۔ اب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا ہے تو اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ روانہ کیا جارہا ہے۔ اسی طرح پر موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسط سے بھی ہم نے فرعونی ناکامی اور موسوی کامیابی کی بابت بھی بہت سی پیشگوئیاں شائع فرمائیں جن کا ذکر اسی سورۃ میں آئندہ چل کر آرہا ہے۔ جب ان کے پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے مصر چھوڑ کر دوسری جگہ جانا پڑا جہاں پر اسرائیلیوں کو ہماری دی ہوئی کتاب پر آزادانہ طور پر عمل کا موقعہ ہاتھ آیا کہ وہ اللہ پاک کے سوا کسی دوسرے کی طرف مائل نہ ہوں۔ قبل ازیں اسی طرح پر نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئیاں بھی کہ وہ اور اس کے اعوان و انصار کامیاب اور دشمن سب ناکام ہوں گے پوری ہوئیں کہ انہیں کشتی میں بٹھا کر بچایا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ پھر بعد میں بچے ہوئے لوگوں کا سلسلہ نسل چلا کر آج ہم تمہیں اس بندۂ شکرگزار کی سنت پر دعوت دے کر شکرگزاری کے لئے خطاب کر رہے ہیں (صفحہ 111-113) ابتدائی آیت کریمہ پر کتب تفاسیر میں عموماً اس کے اسراء نبوی کو بیان کیا گیا ہے جس کا موضوع اور صحیح حدیثوں میں بتصریح ذکر ہے اور بعض ائمہ صحاح نے بھی اس آیت کریمہ کو عنوان بنا کر ان حدیثوں کو بیان فرمایا ہے مگر متونِ حدیث میں آیت کریمہ کا کوئی ذکر نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا اسراء بیان فرماتے ہوئے اس آیت کریمہ کا ذکر فرمایا اور کسی روایت میں اس آیت کریمہ کا وہ شان نزول بھی مروی نہیں جس کا اسراء کی حدیثوں میں ذکر ہے اور جو کتب زرائد میں قتادہ اور زر بن جیش سے مقطوعاً اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ سے موقوفاً اور ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ سے مرفوعاً اسی آیت کریمہ کا ذکر مروی ہے تو وہ محدثانہ طریق پر سخت مخدوش ہونے پر بھی مسترد نہیں کہ وہ قرآنی لفظوں کے اطلاق اور تناسب پر محمول ہے۔ علاوہ اس کے اسراء کی جن حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہاب کا ذکر ہے ان میں آپ کے ایاب کی بھی تصریح ہے مگر آیت کریمہ میں جس اسراء کا ذکر ہے اس میں واپسی کا کوئی ذکر کیا اشارہ تک بھی نہیں (صفحہ 114)۔“

(سورۃ الانفال میں جو عدوۃ الدنیا اور عروۃ

القصویٰ کا ذکر آیا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ) بدائکہ سے قصویٰ ہوا اور جب یہ قصویٰ ہے تو مدینہ بالا ولیٰ قصویٰ ٹھہرا اور اس کی مسجد (نبوی) اقصیٰ ہوئی۔ بلکہ وفاء الوفا جلد نمبر 1 صفحہ 16 میں مطالع وغیرہ کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا مسجد اقصیٰ بھی ہے (ص 121)۔ صحیح بخاری و پارہ 15 صفحہ 476) میں ہے کہ مسجد نبوی جس جگہ تعمیر ہوئی اس جگہ پر آپ کی تشریف آوری سے پہلے مسلمان اس میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اور فتح الباری پارہ 15 صفحہ 477) میں ابن سعد سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ پر اسد نماز پڑھایا کرتے تھے اور وفاء الوفاء (جلد 1 صفحہ 232) میں بحوالہ ابن اسحٰق منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مسجد نبوی کی جگہ میں اسعد بن زرارہ پنج وقتہ نماز پڑھتے اور پڑھایا کرتے تھے بلکہ جمعہ بھی وہی پڑھایا کرتے تھے۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ بھی وہاں پر ہی نماز پڑھتے پڑھاتے رہے۔ پھر اس کے بعد اسعد کی کوششوں سے آپ نے وہاں پر مسجد تعمیر فرمائی جو کہ آج تک مسجد نبوی کے نام سے موسوم ہے۔ اور جہاں پر مسجد قبا تعمیر ہوئی۔ وہاں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے پنج وقتہ نماز بلکہ جمعہ بھی پڑھا پڑھایا جاتا تھا اور امام سالمؓ تھے اور خطیب مصعب تھے...... فتح الباری (پارہ 15 صفحہ 476) میں بحوالہ ابن ابی شیبہ جابرؓ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جہاں جہاں پر تبلیغ و اشاعت سے اسلام پھیلا اور لوگ مسلمان ہوئے وہاں پر مسجد بنا کر نماز شروع کر دی گئی۔ (صفحہ 24-122)۔

[اس کے بعد محترم مصنف نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں جو آیا ہے خُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ تو اس میں المسجد سے کیا مراد ہے۔ انہوں نے بدلائل و براہین واضح کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مسجد اقصیٰ نہیں جس کا ذکر آیت اسریٰ میں آیا ہے۔ جس مسجد کا ذکر آیتہ اسریٰ میں آیا ہے اس سے مراد مدینہ طیبہ ہی ہے۔ بیت المقدس والی مسجد کا نام مسجد اقصیٰ بعد میں رکھا گیا تھا۔ (صفحہ 244-125)]

☆☆☆

مولانا مرحوم نے اپنے مقالہ میں ''اسریٰ'' کا ترجمہ ''لے گیا'' کے بجائے ''لے جائے گا'' (روانہ کر دے گا) کیا ہے۔ یعنی ماضی کے بجائے مستقبل۔ اس کی تائید میں بھی انہوں نے دلائل دیئے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔

☆☆☆

1۔ (حاشیہ از مصنف) یہ عجیب بات ہے کہ جس اونٹنی پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت طے فرمایا وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر مسجد نبوی کی جگہ میں بحکم خداوندی بیٹھ گئی اور اس کا نام قصویٰ (قصواء) قرار پایا (زاد المعاد۔ عمدۃ الغاری۔ وفاء الوفاء)۔ [اسی قصویٰ پر حضور ﷺ نے تمام بڑے بڑے اہم سفر طے فرمائے]

2۔ ان مقامات پر اردو ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ (طلوع اسلام)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ملّتِ اسلامیہ کا مقنّنِ اعظم
امام ابوحنیفہؒ

تاریخ شہادت دے رہی ہے کہ ابتدائے آفرینش سے نوع انسانی کی رشد وہدایت کے لئے نبوت اورنزول وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور بال آخر حضور رسالتماب ﷺ کی ذات اقدس و اعظم کے ساتھ یہ سلسلہ حاصلِ تکمیل کو پہنچ گیا۔ قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کو اپنے نظامِ معاشرہ کے لئے جن اصول و اقدار کی ضرورت تھی وہ قرآن کریم کی دفتین میں محفوظ کر دیئے گئے اوران کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ نوع انسانی کی ہدایت اور راہ نمائی کے سلسلے میں اس عظیم ترین خدائی فیصلے کے بعد امت مسلمہ کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان اصول و اقدار کی غیر متبدل اور محکم اساس پر' زمانہ بہ زمانہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر' نظام معاشرہ کی جزئیات طے کرتی ہوئی زندگی کی شاہراہوں پر حفظ و امن سے آگے بڑھتی چلی جائے۔ دینِ خداوندی کا یہی وہ منشاو مقصود تھا جس کی عملی تشکیل حضور نبی اکرم ﷺ والذینؓ معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کی ضرورتوں کے مطابق دین خداوندی کو محسوس پیکروں کی صورت دی اور اس نظام کی جزئیات مرتب فرمائیں۔ اور جب آپ ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو آپ کے جلیل القدرؓ جانشینوں نے اس نظام کو احسن انداز سے آگے بڑھایا۔ حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ جو نئے نئے تقاضے ابھر کر سامنے آئے ان کے پیش نظر جہاں جزئیات دین میں تبدیلیوں کی ضرورت پیش آئی وہاں ان میں تبدیلی بھی کی گئی ۔ اور جہاں ایسی تبدیلی کی ضرورت پیدا نہ ہوئی وہاں پہلے سے طے شدہ جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھا گیا۔ یہ سب نظائر اور تبدیلیاں ہماری تاریخ دین کے اوراق میں آج بھی جگمگاتی دکھائی دے رہی ہیں اور بتا رہی ہیں کہ ثبات وتغیر کا یہی وہ حسین امتزاج تھا جس کے سہارے ہمارا کارواں کامرانیوں اور شادمانیوں کے جلو میں زندگی کی ارتقائی منزلوں پر قدم بڑھاتا گیا۔ اور جب تک یہ صورت قائم رہی اسلام کی جہانگیری اور عالم آرائی کا سلسلہ ترقی پذیر رہا۔

لیکن ابھی نصف صدی پوری نہ ہونے پائی تھی کہ خلافت' ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور اس کے بعد اسلام کی گاڑی جس نئی پٹڑی پر ڈال دی گئی اور دینِ خداوندی کا نقشہ جس انداز سے بدلا گیا اس کی داستانِ غم ہماری تاریخ کا سب سے المناک باب ہے۔ ملوکیت خدا کے دین میں ایک شجر ممنوعہ اور شرفِ انسانی کے لئے ایک جذام کی حیثیت رکھتی

ہے اور اس کا سب سے گھناؤنا کردار یہ تھا (اور ہمیشہ یہی رہا ہے) کہ سیاسی امور و اختیارات حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور مذہبی معاملات پیشوائیت کے سپرد کر دیئے۔ یہ بعینہٖ عیسائیت کے ''قیصر اور کلیسا'' کا سا گٹھ جوڑ تھا جس نے دینِ خداوندی کی ناقابلِ تقسیم وحدت کو مذہب اور سیاست کی ثنویت میں بدل دیا۔ یہ حکمران اب بھی خلافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے اور صدیقِ اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی طرح خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے القاب اختیار کئے ہوئے۔ لیکن وہ وحدت دین جو ثبات و تغیر کی ہم آویزی سے دین کے نشو و ارتقا کی ضامن تھی زیر و زبر ہو کر رہ گئی۔ سیاست کے سلاطین کے ہاتھوں میں منتقل ہو جانے کے بعد زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق' اسلامی اصولوں کی روشنی میں قوانین مرتب کرنے کا اہم فریضہ انفرادی کوششوں کے سپرد ہو گیا۔ انہی کوششوں کا نام اجتہاد ہے اور ہمارے اسلاف میں جن برگزیدہ شخصیتوں نے اس سلسلے میں کد و کاوش کی وہ امت کے امام۔ فقہا اور مجتہدین کہلائے۔

فقہا و محدثین کے اس گروہ میں جو امت میں عقیدت اور احترام کا ایک مخصوص مقام رکھتا ہے' امام ابو حنیفہ علیہ الرحمتہ کا اسم گرامی سرفہرست نظر آتا ہے۔ اور ان کے اجتہاد کو امت میں صدیوں سے جو امتیازی حیثیت حاصل ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ امام موصوف کو ملت اسلامیہ کے عظیم مقنن کا مقام و منصب حاصل ہے۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ عباسی سلطنت کے زیر عتاب تھے اور جیل خانے کی کوٹھڑی میں جان دی لیکن جب ان کا جنازہ اٹھا تو پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان اس جنازہ کے ساتھ تھے۔ بغداد کے قاضی شہر حسن بن عمارہ نے انہیں غسل دیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ یہ کہتے جا رہے تھے کہ:

''واللہ! تم سب سے بڑے فقیہہ۔ بڑے عابد۔ بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں موجود تھیں۔ تم نے اپنے جانشینوں کو اس سے مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں۔''

حضرت عبداللہ ابن المبارک جیسی اس دور کی عظیم مذہبی شخصیت نے ان کے مزار پر کھڑے ہو کر بادیدۂ تر کہا:

''ابو حنیفہ! خدا تم پر رحم کرے۔ ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ افسوس کہ تم نے پوری دنیا میں کوئی جانشین نہ چھوڑا۔''

ان کی عظمت پر فضل بن عیاض' جعفر بن ربیع۔ ملیح بن دکیع' ابن جریح اور امام مالک (رحمہم اللہ) جیسی شخصیتوں نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ امام مالکؒ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

''اگر وہ (امام ابو حنیفہؒ) اپنے قیاس سے مسجد کے ان ستونوں کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہیں تو تم یقین کر لو کہ یہ واقعی لکڑی کے ہیں۔''

امام ابو حنیفہؒ کی عظمت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے فقہ اسلامی کی باضابطہ ترتیب و تدوین کی سب سے پہلی اور مؤثر کوشش کی اور اسی بنا پر انہیں ''امام اعظم'' کے عظیم القدر خطاب سے نوازا گیا۔ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ان کی فقہ کا مدار قیاس پر تھا اور قیاس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم کے اصولوں کی روشنی میں اپنے

اجتہاد سے دین کی جزئیات مرتب کی جائیں اور جو لوگ فقہ اسلامی اور اس کی تاریخ کا علم رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے فقہ کی اس عظیم الشان ترتیب میں احادیث سے بہت کم مدد لی۔ اس کی وجہ یہ قطعاً نہ تھی کہ امام موصوف کو احادیث نہیں مل سکتی تھیں یا انہیں علم حدیث پر عبور حاصل نہیں تھا۔ اگرچہ ان کے مخالفین نے ان پر یہ الزام عائد کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ احادیث کے معاملہ میں بے بہرہ تھے لیکن یہ الزام افسوسناک مخالفت کا شاخسانہ تھا اور اس کی تردید کرتے ہوئے شمس الائمہ سرخسیؒ نے لکھا تھا کہ:

''امام ابوحنیفہؒ کی قلتِ روایت کی بنا پر بعض مخالفین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ حدیث سے واقف ہی نہیں تھے۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ وہ تو اپنے زمانے کے حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے لیکن کمالِ ضبط کی شرط ملحوظ رکھتے ہوئے روایت سے بہت کم کام لیتے تھے۔''

(کشف الاسرار، جلد دوم، ص: 718)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام موصوف کی قلتِ روایت کی وجہ تھی کہ اس زمانے میں ابھی احادیث کے مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اس دلیل کو بھی غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ اپنے خطبات میں انہوں نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانے میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب 30 سال پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک نہیں پہنچ پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے۔ جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ حنفی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔''

(خطبات اقبال۔ ص 164-163)

خود علامہ محدث امام ذہبیؒ نے اپنی کتاب ''حفاظِ حدیث'' اور حافظ ابو المحاسن دمشقی الشافعی نے اپنی تصنیف ''عقود الجمان'' میں امام اعظمؒ کو بہت بڑا ماہر علم حدیث قرار دیا ہے۔ علامہ ابن خلدون ''فصل علوم الحدیث'' میں لکھتے ہیں:

''فنِ حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کا کبار مجتہدین میں شمار اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔''

ابن خلدون نے امام اعظمؒ کے عام روایات کو نظر انداز کرنے کے مسلک کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ:

"والامام ابو حنیفه انما قلت روایة لما شدد فی شروط الروایة والتحمل۔

یعنی امام ابوحنیفہ کی روایات اس لئے کم ہیں کہ انہوں نے روایت اور تحمل کی شروط میں سختی اختیار کی۔۔۔"

اصل وجہ یہ تھی کہ امام اعظمؒ حدیث کو وحی الٰہی کی طرح نہ تو غیر متبدل سمجھتے تھے اور نہ ہی شک وشبہ سے بالاتر۔ ان کے نزدیک دین خداوندی کی بنیاد یقینیات پر تھی اور احادیث کو یقینیات کا درجہ حاصل نہیں۔ وہ کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے اجتہاد اور اہل الرائے کے مشورے سے فقہ کی تدوین کرتے تھے اور اگر کوئی یہ اعتراض کرتا کہ آپ کا یہ فیصلہ رسول اللہ ﷺ کی فلاں حدیث کے خلاف ہے تو اس کے جواب میں وہ یہی کہتے جو حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ کا وہ فیصلہ اس زمانے کے لئے تھا اور اس دور کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں اور اسی تبدیلی کی بنا پر فیصلے میں بھی تبدیلی ضروری ہے۔ یا وہ حضرت عائشہؓ اور دیگر صحابہ کبارؓ کے اتباع میں یہ کہتے کہ کیا معلوم رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا تھا اور سننے والے نے اسے کیا سمجھا؟ ہم کتاب اللہ کی موجودگی میں غیر یقینی چیزوں کو دین کا حصہ نہیں قرار دے سکتے۔ چونکہ وہ اس حقیقت کو واضح اور نمایاں کرنا ضروری سمجھتے تھے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ نہ تو یقینی ہیں اور نہ غیر متبدل' اس لئے احادیث کے رد میں وہ بعض اوقات شدت بھی اختیار کر لیتے تھے۔ ابو

صالح فراء کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط کو یہ کہتے سنا کہ "امام ابوحنیفہؒ نے رسول اللہ ﷺ کی چارسو بلکہ چارسو سے بھی زیادہ حدیثوں کو رد کر دیا ہے۔" ابوسائب کہتے ہیں کہ میں نے حدیث کے مشہور عالم امام وکیع کو یہ کہتے سنا کہ "ہم نے ابو حنیفہؒ کو دو سو حدیثوں کی مخالفت کرتے ہوئے پایا۔" عبدالاعلیٰ بن حماد اپنے والد حماد بن سلمہ سے نقل کرتے ہیں کہ "ابوحنیفہؒ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں آتی تھیں مگر وہ اپنی رائے سے انہیں رد کر دیا کرتے تھے۔" امام احمد بن حنبلؒ نے بھی مؤمل کے واسطے سے حماد بن سلمہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ (تاریخ خطیب' جلد نمبر 13' ص 93-91)

ابواسحٰق فزاری کہتے ہیں کہ میں ابوحنیفہؒ کے پاس جا کر مسائل جہاد کے متعلق سوال کیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا۔ ابوحنیفہ نے اس کا جواب دیا۔ اس پر میں نے کہا کہ اس بارے میں رسولؐ اللہ کا ارشاد تو اس طرح ہے۔ ابوحنیفہؒ نے کہا "ہمیں اس سے معاف رکھو۔" علی ابن عاصم کہتے ہیں کہ ہم نے ابوحنیفہؒ کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنائی تو ابوحنیفہ نے کہا کہ "میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ ابو حنیفہ نے پھر کہا "ہاں ہاں میں اسے قبول نہیں کرتا۔"

(تاریخ خطیب' جلد نمبر 13' ص 387)

یحیٰی بن آدم کہتے ہیں کہ ابوحنیفہ کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی کہ رسول اللہ نے فرمایا ہے "وضو آدھا ایمان ہے" ابوحنیفہ کہنے لگے۔ "پھر تو دو وضو کر ڈالو تا کہ تمہارا ایمان مکمل ہو جائے"۔ اسی طرح ان کے سامنے یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ "لا ادری (میں نہیں جانتا) کہہ دینا آدھا علم ہے" ابوحنیفہؒ کہنے لگے کہ

’’بس دو مرتبہ لاادری کہہ دینا چاہیئے تا کہ علم مکمل ہوجائے۔‘‘

یہ تھا فقہ اسلامی کے اس امام اعظمؒ کا احادیث کے بارے میں مسلک۔ امام اعظمؒ نے اس مسلک کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ ’’خود رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جزئیات دین کی تعیین میں آپ صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے اور جو رائے بہتر ہوتی اسے اختیار فرما لیا کرتے تھے‘‘۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ ’’اگر میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلس مشاورت میں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضور ﷺ میری ذاتی رائے کو اختیار فرما لیتے‘‘۔ تاریخ خطیب میں محمود بن موسیٰ اور ابوصالح الفراء کی زبانی یوسف بن اسباط کی یہ روایت قدرے مختلف اور جدا جدا الفاظ میں درج ہے۔

(تاریخ خطیب۔ جلد نمبر 13، ص 390,387)

خطیب نے یہ کچھ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

’’میں ایک روز ابوحنیفہ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ مجھ سے یحییٰ بن سعید نے بیان کیا۔ انہوں نے محمد بن حبان سے۔ انہوں نے رافع بن خدیج سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچو ورنہ اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔ اس پر ابوحنیفہؒ نے بلا تامل کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا۔ چنانچہ اس چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔۔۔ (ایضاً)۔‘‘

صحابۂ کبارؓ کے اتباع میں امام ابوحنیفہ کا یہی وہ مسلک تھا جس کی بنا پر وہ ’’اہل الرائے کے امام اعظم‘‘ کہلائے۔ اہل الرائے کے مقابلے میں دوسرا گروہ ’’اہل حدیث‘‘ کا تھا۔ چنانچہ اس دوسرے گروہ کے چوٹی کے محدثین نے امام اعظمؒ کی مخالفت میں افسوسناک الفاظ استعمال کئے ہیں اور تاریخِ خطیب میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ امام مالک بن انسؓ نے کہا تھا کہ ’’ابوحنیفہ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں۔ دونوں باتوں میں۔۔ عقیدۂ ارجاء میں بھی اور احادیث کو رد کرنے میں بھی‘‘۔ عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ ’’میں دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنے کو (پناہ بخدا) ابوحنیفہ کے فتنے سے بڑا نہیں دیکھتا۔‘‘ فزاری کہتے ہیں کہ ’’میں نے سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ’’اسلام میں ابوحنیفہ سے زیادہ (خاکم بدہن) بدبخت ترین پیدا نہیں ہوا۔‘‘ قیس بن ربیع سے ابوحنیفہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ’’ماضی (روایات و آثار) میں جاہل ترین اور مستقبل (استنباط احکام) کا عالم ترین شخص ہے۔‘‘ عمرو بن قیس کا قول ہے کہ ’’جو شخص حق کو معلوم کرنا چاہتا ہے اسے کوفہ جا کر ابوحنیفہ اور اس کے اصحاب کے قول کو دیکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ان اقوال کے خلاف کرنا چاہیئے۔‘‘ (کیونکہ وہی حق ہے) بشری کہتے ہیں کہ ’’تم ابوحنیفہ کی

مخالفت کروگے تو حق کو پالو گے۔'' عمار بن زریق کہتے ہیں ''ابوحنیفہ کی مخالفت کرو۔ تم حق کو پالو گے''۔ ابن عمار کا قول ملاحظہ ہو۔ کہہ رہے ہیں کہ ''جب تمہیں کسی بات میں شک ہوتو دیکھ لوکہ ابوحنیفہ نے کیا کہا ہے۔ بس اس کی مخالفت کروکہ حق وہی ہوگا یا یوں کہو کہ اس کی مخالفت میں ہی برکت ہے۔'' ابو عبید سے روایت ہے کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آ گیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں تو سودؒ نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ ''تو مسجد میں ابوحنیفہ کا تذکرہ کرتا ہے۔'' اور مسجد میں ابوحنیفہ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک پھر مجھ سے کلام نہ کیا۔

معاملہ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ اور آگے بڑھا۔ تاریخ خطیب میں فقہ حنفی کی مخالفت کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ ممدویہ بن مخلد کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ مدینی سے پوچھا گیا ''کیا وجہ ہے کہ ابوحنیفہ کی رائے سارے شہروں میں گھس گئی ہے مگر مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہوسکی۔'' محمد بن مسلمہ نے جواب دیا کہ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی ہر گلی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو مدینہ میں دجال کو داخل ہونے سے روکے گا اور یہ بھی چونکہ دجالوں کا کلام ہے اس لئے وہاں داخل نہیں ہوسکا۔'' (استغفر اللہ)۔

یہ امام اعظمؒ کے بارے میں محدثین کے مشہور بزرگوں کے نقطۂ نظر کا ایک مختصر سا جائزہ ہے۔ مخالفت کا یہ گھناؤنا انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ امام اعظمؒ احادیث کو غیر متبدل قانون کی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس صورتِ حال پر مصر کے دورِ حاضر کے ایک مشہور عالم ابوزہرا نے اپنی کتاب ''امام ابوحنیفہؒ'' میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ مصر کے اکثر علماء کی طرح ابوزہرا کا تعلق شافعی مسلک سے ہے۔ اس کے باوجود انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

''مگر (امام ابوحنیفہؒ کے) مخالفین کی صف میں زیادہ تر وہی لوگ نظر آتے ہیں جو استقلالِ فکری میں ان کے مقابلہ میں عاجز تھے یا ان کے مدارک فقہ تک رسائی سے محروم تھے۔ یا پھر وہ تنگ مزاج مخالفین تھے جو ہر اس طریقِ فکر کو جو اقوالِ اسلاف سے ماخوذ نہ ہو حقِ معروف سے خارج اور بدعتِ منکر خیال کرتے ہیں۔ امام صاحب سے ان کے بھڑکنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کی نظر میں جہاں توقف واجب تھا یا اخذ قلیل سے کام چل سکتا تھا وہاں امام صاحب بے دھڑک رائے اور قیاس کا استعمال فرمایا کرتے تھے............

امام صاحب کے بعض نکتہ چین وہ ہیں جو ان کی شانِ مروت و اتقا اور علم و فضل سے آشنا نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل وافر، علم گراں بہا، قدر خطیر اور عوام و خواص کی نگاہ میں رتبۂ خاص سے نوازا ہے۔ امام صاحب کی ذات گرامی پر قدح کرنے والوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو اور ان کی کثرتِ کلام کا عالم کچھ ہی کیوں نہ ہو............ مگر یہ امر واقعہ ہے کہ تاریخ نے اس فقیہہ عراق پر طعن و تشنیع کرنے والوں کے مقابلے میں ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں بھی جو ان کی زندگی میں مصروفِ افترا تھے اور ان کے مقابلے میں بھی

جو موت کے بعد بھی افترا پردازیوں سے باز نہ آئے۔ لوگوں نے گوش ہوش سے ان لوگوں کی باتیں سنیں جنہوں نے امام صاحب کی صفت وثنا بیان کی ہے۔ اسے شہادتِ صدق اور قولِ حق سمجھ کر کہنے والوں کی تعریف کی۔ اور سمجھ لیا کہ دشنام طرازی کی روشن دلیل ہے اس بات کی کہ انسان جب قدر وفکر، اخلاص ومروت اور دین کے لحاظ سے عظمت ورفعت حاصل کر لیتا ہے تو افترا اسے محفوظ نہیں رہتا۔ اور یہ چیز اس کی آزمائش اور جزا میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔''

(ص99-100)

اس مکتبِ فقہ کی بارگاہ سے جس نے امام اعظمؒ کے خلاف وہ کچھ کہا تھا جسے ہم (دل پر پتھر رکھ کر) اوپر نقل کر آئے ہیں، یہ خراجِ تحسین امام موصوف کی عظمت کا بہت بڑا اعتراف ہے۔ ساتھ ہی امام ابوحنیفہؒ کی وسعت قلبی اور بلند نگہی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جہاں ان کے مخالفین نے ان کے خلاف یہ کچھ کہا وہاں امام صاحب نے جو نعرہ بلند کیا وہ یہ تھا کہ:

''اے اللہ! جن لوگوں کے سینے ہمارے لئے تنگ ہیں ہمارے سینے ان کے لئے فراخ ہیں۔''

(تاریخ بغداد، جلد نمبر 13، ص 352)

اس مقام پر ایک اور اہم حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ کیا امام اعظمؒ کا منشاء یہ تھا کہ وہ اپنی فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدل سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے بعد فقہ حنفی کی تقلید کرنے والوں نے سمجھ لیا۔ جس شخص کا اپنا عقیدہ یہ ہو کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے فیصلے بھی قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار نہیں پا سکتے وہ اپنے تفقہ واجتہاد کو کیونکر غیر متبدل اور ہمیشہ کے لئے واجب تقلید قرار دے سکتا ہے۔ اس باب میں تاریخی شہادات موجود ہیں کہ امام اعظمؒ نے اسے قطعاً پسند نہیں کیا کہ ان کے اجتہادات کو ابدی حیثیت دے دی جائے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات کو شدت سے روکا۔ چنانچہ تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ:

''نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ شام کا ایک شخص بھی ہوتا تھا۔ جب وہ شامی وطن کو واپس جانے لگا تو رخصت ہونے کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا۔ امام ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ گے''؟ شامی نے جواب دیا ''ہاں!'' اس پر امام نے فرمایا۔ ''خیال رکھنا! تم بہت بڑے شر کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہو۔'' (جلد نمبر 13۔ ص 401) مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ ''جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے۔ جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔'' امام ابوحنیفہ نے فرمایا ''بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو۔''

امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ ابو یوسف اور محمد

بن الحسن بھی ہوتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہ فیصلے فرماتے ہم ان کو یکجا لکھ لیا کرتے تھے۔ امام زفر کہتے ہیں کہ ایک دن ابوحنیفہؒ نے ابو یوسفؒ سے فرمایا ''یعقوب تیرا ناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔'' ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابو یوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں (اپنے اجتہاد میں) خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً)۔ سہل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا۔ فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿۱۷﴾ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ ط (39:17-18) یعنی اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو بشارت دے دو جو باتوں کو سنتے ہیں پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ (ایضاً 14، ص 352) حسن بن زیاد لؤلوی کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہمارا یہ قول (فقہ) ایک رائے ہے جو بہتر سے بہتر ہم قائم کر سکے ہیں۔ جو ہمارے قول سے بہتر رائے لا سکے تو وہی صحت کے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)۔''

امام اعظمؒ کے یہ اقوال آخر کس حقیقت کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ کیا ان تصریحات سے صاف طور پر یہ واضح نہیں کہ امام موصوف اپنے اجتہاد کو سہو و خطا سے مبرا نہیں سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم ان کی فقہی کوششوں کو حرف آخر کا درجہ دے دیں اور قیامت تک کے لئے اسے امت کا دستور العمل بنا دیں۔

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ امام اعظمؒ نے اپنے اجتہاد کے بارے میں یہ کچھ تصریحات فرمائیں اور اس کے بعد وہ کروڑوں انسان جنہوں نے فقہ حنفی کو اپنا کر انہیں اپنا امام تسلیم کیا وہ اس عقیدہ پر جم گئے کہ فقہ حنفی کی حیثیت غیر متبدل ہے۔ حالات کے تقاضوں کی بنا پر اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ آگے بڑھا۔ اور یہ عقیدہ وضع کیا کہ آیاتِ قرآنی کی وہی تفسیر قابل قبول سمجھی جائے گی جو فقہ حنفی سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفقہ و اجتہاد کا وہ عظیم الشان سلسلہ جس کا آغاز اس مقنن اعظمؒ کے ہاتھوں ہوا تھا منجمد ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ نہ صرف منشائے دین کے خلاف تھا بلکہ ان عظیم مقاصد کے بھی سراسر منافی تھا جنہیں امام اعظمؒ لے کر اٹھے تھے اور جن کے باعث انہیں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ابوزہرا فقہ حنفی کے اسی افسوسناک انجام کا ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اگر فقہ حنفی میں تخریجِ مسائل کا کام اسی آزادی سے جاری رہتا اور اصحابِ تخریج ائمہ سلف کی طرح فقہی مسائل میں غور و خوض کرتے رہتے تو موجودہ وقت کی دشواریوں پر بھی بخوبی قابو پایا جا سکتا تھا اور کتاب وسنت یا فقہی اصول وقواعد سے بغاوت اختیار کئے بغیر حالات کے مطابق مسائل کا استنباط ممکن تھا اور یہ آراء یقیناً فقہ حنفی کا ایک جزء بننے کی صلاحیت رکھتے۔ لیکن افسوس کہ عوام

پر جمود طاری ہو گیا اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ جمود ان کا نہیں بلکہ فقہ اسلامی کا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔''

(امام ابوحنیفہؒ ص 695)

آگے چل کر وہ مزید آنسو بہاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

''بد قسمتی کی بات ہے کہ متاخرین نے اس دروازے کو بند کر دیا اور اب ان کے لئے اس کے سوا کوئی کام نہ رہ گیا کہ ترجیح شدہ اقوال و آراء کو سامنے رکھ کر فتویٰ دے دیا کریں۔ اب یہ اس کے مجاز نہیں رہ گئے کہ جن مسائل میں کوئی نص موجود نہیں ہے ان پر اجتہاد کر کے کوئی رائے قائم کر سکیں۔ ان کے نزدیک مذہب مدون ہو چکا۔ کتابیں مرتب ہو چکیں۔ لہٰذا ہر حنفی پر واجب ہے کہ آنکھ بند کر کے تقلید کرتا چلا جائے۔'' (ایضاً ص 702)

علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے خطبات میں اس افسوسناک صورتِ حال کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے جو عہدِ رسالت ﷺ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلے میں نافذ ہوئے۔''

(خطباتِ اقبالؒ۔ اسلامی قانون شریعت میں اصول ارتقاء)۔

سچ پوچھئے تو امام اعظمؒ اور ان کے رفقائے جلیل کی عظیم الشان اجتہادی کاوشیں ہمارے لئے اس مرحلہ پر نشان راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پاکستان پہلے دن سے اسلامی قوانین کی ازسرنو تشکیل کی اہم ضرورت سے دوچار ہے۔ ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ اس راہ میں ایک مستقل روک بن کر کھڑا ہے۔ اپنی قدامت پسندی اور تفرقہ بازی کے باعث وہ نہ خود اس کا کوئی متفق علیہ حل پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان حالات میں اس مرحلہ کو کامیابی سے طے کرنے کی واحد صورت وہی ہے جس کی نشان دہی امام اعظمؒ نے فرمائی تھی اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی پابندی اختیار کرتے ہوئے اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین کی تشکیل باہمی مشاورت سے عمل میں لائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ قدامت پرستی کے شوروشر کے پیش نظر یہ راہ اختیار کرنے میں بڑی جرأت اور ہمت درکار ہے۔ لیکن ایسا کئے بغیر ہم ایک قدم بھی کامیابی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ علامہ اقبالؒ اسی سلسلۂ تفصیل میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام

1 دیکھئے ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دے گا۔''

(خطبات اقبال۔ص156)

اس سلسلے میں انہوں نے مزید بتایا ہے کہ:

''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن بھی..........افسوس کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔''

(اقبال نامہ۔جلد اول۔ص50)

لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد وہ وقت اب یقیناً آ گیا ہے جس کے متعلق علامہ مرحوم نے اپنے خطبات میں یہ پیشگوئی کی تھی کہ:

''یہ سوال زود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ: حسبنا کتاب اللہ۔''

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خطبہ کے اختتام پر فرمایا تھا کہ:

''اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے۔ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ (ختم نبوت کے) بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرے کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔''

ارضِ پاکستان اس انتظار میں ہے کہ پھر کوئی عمر فاروقؓ۔ امام اعظمؒ اور اقبالؒ کی روح کو لے کر اٹھے اور قانون سازی کے سلسلے میں، اس مملکت کو اس طلسم پیچ و تاب سے نجات دلائے جس میں یہ بدقسمتی سے ستاون برس سے بری طرح گرفتار چلی آ رہی ہے اور جس سے نکلنے کی ابھی بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں ولکم ماندہ دریں کشمکش اندر

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذشتہ سے پیوستہ

پیامِ فصلِ بہار
طلوعِ اسلام کی تیسری کنونشن منعقدہ لاہور

19 تا 21 اپریل 1959ء

(روئیداد، ماخوذ از طلوعِ اسلام مئی 1959ء)

قرآن کا معاشی نظام:

آج ہمارے لئے یہ سوال بھی معمہ بن گیا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اگر کسی سے کہہ دیا جائے کہ اس نظام میں فاضلہ دولت کسی کے پاس نہیں رہتی تو اُسے اس میں کمیونزم کے جراثیم دکھائی دیتے ہیں، حالانکہ اگر قرآن کے اس فلسفہ کو سمجھ لیا جائے جو اُس نے ارتقائے انسانیت کے سلسلہ میں بیان کیا ہے تو اس کے معاشی نظام کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کا فلسفہ یہ ہے کہ اگر کوئی فرد، گروہ یا قوم آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتی، اسے وہ بخل کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے **وَمَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ** (47:38) جو روک کر رکھتا ہے وہ خود اپنی ذات کی ترقی کو روک دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو فرد، گروہ یا قوم دوسروں کی نشوونما کی فکر کرتی ہے اس کی اپنی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ **وَمَنۡ تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفۡسِہٖ** (35:18) یہ تھا قرآنی تعلیم کا وہ اصل الاصول جسے سرزمینِ حجاز کی اس مختصر سی جماعت نے سمجھ لیا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی ترقی حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہوگئی۔ اس میں نہ کوئی راز تھا نہ معمہ، نہ کوئی ناقابلِ فہم نظریہ تھا، نہ ماورائے عقل فارمولا۔ بعد کے آنے والوں نے اس قانون کو نظر انداز کر دیا۔ انفرادی طور پر ہر شخص نے مال اور دولت کو اپنی اور اپنے خاندان کی حدود کے اندر مقید کر دیا۔

بعد میں کیا ہوا:

قوم میں ایک طبقہ حکمرانوں کا بن بیٹھا اور اس طرح اقتدار و اختیار ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ اور آگے بڑھے تو پوری قوم نے اپنے آپ کو سلطنت کی چار دیواری میں مقید کر کے عالمگیر انسانیت کے تصور کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دنیا داروں کی حالت تھی۔ ''اللہ والوں'' نے روحانی ترقی کے لئے اپنے آپ کو خانقاہوں کی چار دیواری میں محبوس کر کے باقی

انسانیت سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا۔ اربابِ شریعت نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر ہر شخص اپنی اپنی جگہ نیک نیت بن جائے تو اسلام کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ قوم جس مقام پر تھی وہیں متحجر (FOSSILISED) ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ جحیم (رک جانے کا مقام) ہے جس میں قوم اب تک مبتلا چلی آ رہی ہے۔

تقلید:

کسی قوم کے ایک مقام پر رُک جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قوم کی عقل و فکر کی صلاحیتیں نشو و نما پانے سے رُک گئی ہیں۔ یعنی وہ قوم سمجھ سوچ سے کام لینے کے قابل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اہلِ جہنم کی زبان سے یہ کہلوایا ہے۔ **لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيٓ أَصْحٰبِ السَّعِيْرِ** (67:10) اگر ہم اپنی عقل و فکر سے کام لیتے رہتے تو اہلِ جہنم میں سے نہ ہوتے۔
عقل و فکر سے کام نہ لینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ قوم اس حد کو جس تک پہنچ کر اُن کی ترقی رُکی تھی، ارتقائے انسانیت کی آخری حد سمجھ لیتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہے کہ دنیا خواہ کتنی ترقی کیوں نہ کر جائے وہ ہماری حد تک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ اس طرح وہ اپنے جہنم کو جنت سمجھ لیتی ہے اور اس سے کبھی نکلنا نہیں چاہتی۔ یا یوں کہیے کہ اسے اپنا جہنم نظر ہی نہیں آتا، اس لئے کہ جہنم تو اس کے سامنے اُبھر کر آتا ہے جو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ **وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى** (79:36) (جاری ہے)

❁❁❁❁❁

نظر بازگشت:

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ ضمنی نکتہ جو اس سوال کے سلسلہ میں سامنے آ گیا تھا کہ قرآن کریم عالمگیر انسانیت پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے۔ چونکہ ہم اس ضمنی نکتہ کے سلسلہ میں اپنے موضوع سے بہت دور نکل آئے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ داستان کا تسلسل قائم رکھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے کہ بات کیا ہو رہی تھی، اور سلسلۂ کلام کہاں تک پہنچا تھا۔ میں کہہ رہا تھا کہ

(1) سیکولر اسٹیٹ اور دینی مملکت میں فرق یہ ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کے پیشِ نظر اپنی قوم یا ملک کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور اس کے لئے مصلحتِ وقت (EXPEDIENCY) اس کا اصولِ کار۔ اس کے برعکس، دینی مملکت ان غیر متبدل اصولوں یا مستقل اقدار کے تحفظ اور عملی تنفید کے لئے وجود کوش ہوتی ہے جن میں تمام نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت اور نشو و ارتقاء کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

(2) یہ غیر متبدل اصول نہایت واضح انداز میں قرآنِ کریم میں دے دیئے گئے ہیں۔ اسلامی مملکت کا آئین انہی اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

خوف و حزن:

قرآنِ کریم نے اس مملکت کا ماحصل کو چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ: **فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** (2:38) جو لوگ خدا کی رہنمائی میں چلیں گے، وہ خوف اور حزن سے محفوظ رہیں گے۔ خوف سے

محفوظ و مامون رہنا سیاسی صیانت (POLITICAL SECURITY) ہے اور حزن سے محفوظ رہنا معاشی (ECONOMIC INDEPENDENCE) اس مملکت میں نہ کسی قسم کا سیاسی استبداد ہوگا اور نہ معاشی احتیاج۔

کس نبا شد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است وبس

۞۞۞

حکومت کی ہیئت:

جہاں تک حکومت کی ہیئت (FORM OF GOVERNMENT) کا تعلق ہے، قرآن اس کا تعین نہیں کرتا، لیکن اس کے لئے غیر متبدل اصول بیان کرتا ہے۔ یعنی وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) امورِ مملکت امت کے باہمی مشورے سے طے پائیں گے۔ اسلامی مملکت میں نظمِ حکومت کسی خاص فرد، گروہ، طبقہ یا خاندان کی اجارہ داری میں نہیں رہتا۔ یہ اُمت کی امانت ہوتا ہے، جسے وہ اپنے نمائندگان کے سپرد کرتی ہے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان نمائندگان کا معیار یہ ہوتا ہے کہ: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13) جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا وہ سب سے زیادہ واجب التکریم ہوگا۔ اُمت یہی نمائندے قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے۔۔۔ کے تقاضوں کے مطابق مملکت کے لئے جزئی قوانین وضع کریں گے۔ اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اسلامی حکومت نہ کسی خاص وضع کا نام ہے نہ کسی خاص پیکر کا عکس۔ وہ قرآن کی متعین کردہ مستقل اقدار کے حفظ و نشر کا ذریعہ اور ان کی عملی تشکیل و تنقید کی مشینری ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جن ذرائع کو اختیار کرے وہ اسلامی کہلائیں گے، بشرطیکہ وہ ذرائع بھی قرآنی اصولوں سے نہ ٹکرائیں۔ قرآن اقدار کو برقرار رکھتے ہوئے جو انداز بھی اختیار کر لیا جائے وہ اسلامی ہوتا ہے۔

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

آئین سازی میں دشواریاں:

ان تصریحات کی روشنی میں، رفیقانِ من! سوچئے کہ کیا اسلامی آئین کی تدوین و ترتیب میں کسی قسم کی دشواری پیش آ سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں جس قسم کی دشواریاں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔۔۔ کچھ دانستہ۔۔۔ کچھ نادانستہ۔۔۔ اس باب میں ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم نے اسلام سمجھ رکھا ہے ان رسومات اور فقہی جزئیات کو جو ہمارے اُس دور کی وضع یا اختیار کردہ ہیں جب ملت کی گاڑی، دین کی پٹڑی سے اُتر کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تھی۔ جب تک ہم اس غلط فہمی سے نہیں نکلیں گے اور مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے رہیں گے، اسلامی آئین کا تصور تک بھی ہمارے سامنے نہیں آ سکے گا۔ جو حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ جس ''مذہب'' کے متعلق وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسے مملکت کی بنیاد قرار

دے لیا تو ہم زندہ اقوام کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہیں گے، وہ غیر قرآنی مذہب ہے۔ قرآن کا عطا کردہ دین اپنے متبعین کو اقوامِ عالم کی امامت (LEADER-SHIP) کی ضمانت دیتا ہے۔

مذہبِ زندہ دلاں خوابِ پریشانے نیست
از ہمیں خاک جہانِ دگرے ساختن است

اور جب یہ حقیقت ہے کہ ہمارا مروجہ مذہب حقیقی اسلام نہیں تو اس مذہب کے علمبرداروں کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ وہ ہمیں اسلامی آئین مرتب کر کے دیں گے کتنی بڑی خودفریبی ہے۔

خدا جانے یہ کس نے کہہ دیا ہے کم سوادوں سے
کہ جو تیشہ اٹھا لیتا ہے وہ فرہاد ہوتا ہے

علماء اور آئین:

اسلامی آئین کی تدوین کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان قرآن کے غیر متبدل اصولوں کو اچھی طرح جانے اور اپنے زمانے کے تقاضوں سے باخبر ہو۔ جہاں تک ہمارے علماء حضرات کا تعلق ہے وہ بدقسمتی سے ان دونوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلامی آئین کی تدوین کے لئے ان حضرات کی طرف رجوع کرنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا جانیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام

قرآن کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا (4:58) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتوں کو ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ تدوینِ آئین کا مسئلہ قوم کی بہت بڑی امانت ہے۔ اسے ایسے لوگوں کے سپرد کر دینا جن میں اس کی اہلیت وصلاحیت نہیں، امانت میں خیانت ہے۔ ہم نے نو برس تک یہ غلطی کی اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اگر اس کا پھر اعادہ کیا گیا تو اس کی سزا اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی۔

اس مقام پر میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جب اربابِ مذہب پر تنقید کرتا ہوں تو میرا روئے سخن خاص افراد کی طرف نہیں ہوتا۔ اس سے میرا مقصد مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کا ادارہ (INSTITUTION) ہوتا ہے جس کی اسلام میں کہیں گنجائش نہیں۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے ان میں کئی ایسے ہیں جن کی سیرت وکردار کی بنا پر میرے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔

❁❁❁

لوگ نیک بن جائیں تو مملکت اسلامی بن جائے:

اسلامی آئین کے سلسلہ میں بعض گوشوں سے یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اگر لوگ سچے مسلمان بن جائیں، نیک بن جائیں، دیانتداری کی زندگی بسر کرنے لگ جائیں تو مملکت خودبخود اسلامی ہو جائے گی۔ یہ منطق بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ایسا ہی

ہے جیسے کوئی شخص کسی ملک کے ارباب بست وکشاد سے کہے کہ صاحب! حکومت کی مشینری کو درست کیجئے تا کہ جرائم ختم ہو جائیں۔ قانون کا احترام پیدا ہو اور لوگ امن کی زندگی بسر کریں اور اس کے جواب میں وہ یہ کہہ دیں کہ اگر لوگ قانون کا احترام کرنے لگ جائیں، جرائم سے باز آ جائیں، پُرامن شہریوں کی حیثیت سے رہنے لگ جائیں تو حکومت خود بخود اچھی ہو جائے گی۔ قرآن اس باب میں ایک عظیم نکتہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک عام ضابطہء اخلاق کا تعلق ہے، وہ ہر جگہ قریب قریب یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ جھوٹ بولو۔ چوری کرو۔ لوٹ مچاؤ۔ لوگوں پر ظلم کرو۔ بددیانت بنو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برعکس، ہر جگہ یہی کہا جاتا ہے کہ سچ بولنا۔ چوری نہ کرنا۔ کسی پر ظلم نہ کرنا۔ دیانتداری کی زندگی بسر کرنا بہت اچھا ہے لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اس کے مطابق زندگی بسر نہیں کرتے۔ مذہب اپنا فریضہ اتنا ہی سمجھتا ہے کہ وہ وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرے۔ قرآن کہتا ہے کہ محض وعظ ونصیحت سے لوگ نیک نہیں بن سکتے۔ اس لئے نہیں کہ لوگوں پر وعظ ونصیحت کا اثر نہیں ہوتا یا وہ نیک بننے کے آرزومند نہیں ہوتے۔ بجز چند مستثنیات، جس میں سرکش طبائع دانستہ قانون شکنی کرتی ہیں، لوگ صحیح روشِ زندگی پر چلنے کے متمنی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ صحیح روش پر چل نہیں سکتے۔ اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا۔ ایک غلط معاشرہ میں صحیح روش پر چلنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے اندر چند انفرادی خوبیاں پیدا کرلے لیکن اجتماعی امور میں انفرادی اصلاح کہیں کارگر نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ ایک معاشرہ قائم کیا جائے جس میں لوگوں کے لئے صحیح روش کے مطابق زندگی بسر کرنا نہ صرف آسان بلکہ آسائش بخش ہو جائے۔ یعنی جس طرح غلط معاشرہ میں صحیح روش پر چلنے والے کے راستے میں قدم قدم پر مشکلات حائل ہوتی ہیں، اسی طرح صحیح معاشرہ میں غلط روش اختیار کرنے والے کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے اور صحیح راستے پر چلنا اس طرح آسان ہو جائے جس طرح پانی کے لئے نشیب کی طرف بہنا۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ:

قرآن اہل مذاہب سے کہتا ہے مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (4:47) کہ میں ایک مکمل ضابطہء حیات لایا ہوں بلکہ اس ضابطہ میں سے جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے، اسے سچ کرکے دکھانے کا پروگرام بھی ساتھ لایا ہوں۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ ظالم کی کھیتی پنپا نہیں کرتی۔ اور میرے ضابطۂ حیات کا بھی ایک دعویٰ یہ ہے کہ: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135) خدا ظالم کی کشتِ حیات کو کبھی سرسبز نہیں ہونے دیتا۔ تمہاری وعظ ونصیحت کے باوجود ظالموں کے کھیتیاں سرسبز ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن میں عملی پروگرام اپنے ساتھ لایا ہوں اس میں یہ حقیقت سچ بن کر سامنے آجاتی ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ اس عملی پروگرام کا نام قرآنی معاشرہ یا اسلامی مملکت ہے۔ انفرادی طور پر یہ ناممکن ہوتا ہے کہ انسان دنیا کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ شر کی قوتیں اتنی شدید ہوتی ہیں کہ انفرادی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن حقائق کا سامنا کرتا ہے۔ وہ (FACTS) کو (FACE) کرتا ہے۔

رہبانیت سے مقصود:

اس لئے وہ فرد سے ایسی باتیں کہتا ہی نہیں جن کا پورا کرنا اس کی انفرادی وسعت کے بس کی بات نہ ہو۔ رہبانیت کے

متعلق قرآن کا اعلان یہ ہے کہ یہ خدا کا تجویز کردہ پروگرام نہیں، ذہنِ انسانی کی پیدا کردہ مسلک ہے۔ رہبانیت سے مفہوم جنگلوں میں جا کر سنیاسیوں کی زندگی بسر کرنا نہیں۔ اس کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کے بجائے انفرادی زندگی بسر کرنا۔ ہر فرد کا اپنے اپنے طور پر نیک بننے کی کوشش کرنا۔ قرآن اسے غیر خداوندی طریقِ زندگی قرار دے کر اجتماعی زندگی کو صحیح روش بتاتا ہے۔ اسی کو اسلامی مملکت کہتے ہیں۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت تمام لوگوں کو ڈنڈے کے زور سے نیک نہیں بناتی۔ ڈنڈے کا استعمال تو صرف ان کے لئے ہوتا ہے جو دیدہ دانستہ قانون کے خلاف سرکشی برتنے پر اُتر آئیں۔ اس کے پاس لوگوں کو نیک بنانے کا پروگرام اور ہوتا ہے۔ اس میں سب سے پہلے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح نظام قائم کیا جاتا ہے۔ پھر ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں انسان غیر شعوری طور پر قانون کا احترام کرنا سیکھے۔ پھر حالات ایسے پیدا کئے جاتے ہیں جن میں کسی کو حصولِ مقصد کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ناجائز ذریعہ سے مقصد حاصل ہی نہ ہو سکے۔ مثال کے طور پر، قرآن کا معاشی نظام لیجئے جس میں ہر فرد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اور کسی کے پاس فاضلہ دولت جمع نہیں ہونے پاتی۔ آپ غور کیجئے کہ اس نظام میں کسی کو ناجائز ذرائع استعمال کرنے کی ضرورت کہاں پڑتی ہے یا اس کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟ جب رسول اللہ ﷺ نے دینی مملکت قائم کی تھی تو وہ (معاذ اللہ) ہوسِ ملک گیری کی تسکین کا سامان نہیں تھی۔ وہ اس لئے ضروری تھی کہ اجتماعیت کے بغیر اسلامی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا۔ حتیٰ کہ السابقون الاولون کا جو گروپ، اس مملکت کے لئے کوشاں تھا، وہ بھی انفرادی زندگی بسر نہیں کرتا تھا، جماعتی زندگی بسر کرتا تھا۔ لہذا، معاشرہ کی اجتماعی زندگی (یعنی نظامِ مملکت) کے بغیر لوگوں کو نیک بننے کی تلقین کرنا، رہبانیت کی تعلیم ہے، اسلام کی نہیں۔ یاد رکھئے۔ دین، اخلاق و سیاست کے مجموعہ کا نام ہے۔ جب دین سے سیاست الگ ہو جاتی ہے تو دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور سیاست چنگیزیت بن جاتی ہے۔

تمسک بالجماعت سے مفہوم:

ہمارے قرنِ اول کے دینی نظام کے بعد یہی ہوا۔ اسلامی مملکت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی اور دین کا جماعتی زندگی کی جگہ مذہب کی انفرادی زندگی نے لے لی۔ دین نے اسلامی زندگی کا دوسرا نام تمسک بالجماعت بتایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دینی مملکت (یعنی قرآنی نظام معاشرہ) کے بغیر اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ مذہب نے جماعت اور اس سے تمسک کے الفاظ کو تو برقرار رکھا لیکن اس کا مفہوم یہ رہ گیا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا۔ اب جو شخص کہتا ہے کہ میں جماعت کے ساتھ شامل تھا تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں نے نماز با جماعت ادا کی تھی۔ حالانکہ نماز با جماعت، خود اسلام میں اجتماعی زندگی (یعنی دینی مملکت) کی سمٹی ہوئی شکل (MINIATURE FORM) تھی۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ یہ کہنا کہ لوگ اسلامی طریق کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے جائیں تو مملکت خود بخود اسلامی بن جائے گی، گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنے کے مرادف ہے۔ پہلے مملکت

اسلامی بنتی ہے اس کے بعد لوگ اسلامی زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ لوگ پہلے صحیح معنوں میں مسلمان بن جاتے ہیں اور پھر مملکت خود بخود اسلامی ہو جاتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مملکت کا فریضہ ہے۔ اگر لوگ اپنے اپنے طور پر معروف پر کاربند ہوسکتے اور منکر سے محترز رہ سکتے تو مملکت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اسلام میں، دین، جماعت، معاشرہ، نظام، قرآنی مملکت سب ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔

جوشِ شباب، نشہء صہبا، ہجومِ شوق!!
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو

❁❁❁

برادرانِ عزیز! اب مجھے، تدوینِ آئین کے سلسلہ میں ایک اور اہم سوال کے متعلق مختصر الفاظ میں کچھ عرض کرنا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمانوں میں بہتر فرقے ہیں اور ہر ایک کی اسلام کی تعبیر الگ الگ ہے۔ ان حالات میں اسلامی آئین بنایا کس طرح جاسکتا ہے؟ اربابِ مذہب کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ فرقوں کی موجودگی سے اسلام پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ دیکھئے۔ 1951ء میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے متفقہ طور پر ایک آئین کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے مطابق 1956ء کا آئین مرتب بھی ہو گیا تھا۔ جس کے اسلامی ہونے پر تمام علماء کا اتفاق تھا۔ اس بات کا، اس سے بڑھ کر اور ثبوت ہوسکتا ہے کہ فرقوں کے باوجود متفق علیہ اسلامی آئین مرتب ہوسکتا ہے۔

وہ سوال اور اس کا یہ جواب دونوں قابلِ غور ہیں۔

فرقہ بندی شرک ہے:

پہلا قابلِ غور نکتہ ہے کہ کیا فرقے اور اسلام یکجا جمع ہوسکتے ہیں؟ کیا ایسے معاشرہ کو اسلامی کہا جاتا ہے جس میں مسلمانوں کے فرقے موجود ہوں۔ قرآن کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس طرح شرک اور توحید ایک دوسرے کی ضد ہیں، اسی طرح فرقے اور اسلام باہمدگر نقیض ہیں۔ قرآن کا تمام مسلمانوں سے مطالبہ یہ ہے کہ: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103) تم سب مل کر، اکٹھے ہو کر، اجتماعی طور پر سر رشتۂ خداوندی کو تھامے رکھو اور فرقوں میں مت بٹ جاؤ۔ اس سے ایک آیت آگے ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾ (3:105) دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے، خدا کی طرف سے واضح آجانے کے بعد، فرقے پیدا کر لئے اور آپس میں اختلاف کرنے لگ گئے۔ ایسا کرنے والے بہت بڑے عذاب میں ماخوذ ہوجاتے ہیں۔

(ب) سورۃ توبہ میں جہاں مسجد ضرار کی تعمیر کا ذکر آیا ہے تفریق بین المومنین کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے اور ایسی مسجد کو خدا اور رسول کے دشمنوں کی پناہ گاہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔

(ج) فرقہ بندی کو کفر ہی نہیں، بلکہ بالفاظ صریح شرک قرار دیا گیا ہے۔ سورہ روم میں ہے۔......۳۰/۳۱-۳۲......

مسلمانو! دیکھنا تم کہیں مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ پھر ہر فرقہ سمجھنے لگ گیا کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب باطل پر ہیں، اور سب فریبِ نفس میں مگن ہو کر رہ گئے۔

برادرانِ عزیز! وقت کی کمی کی وجہ سے میں قرآن کریم کی ان تمام آیات کو سامنے نہیں لا سکتا جن میں اختلاف کو خدا کا عذاب اور فرقوں کو دین کی ضد قرار دیا گیا ہے۔ آپ انہی چند آیات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ یہ کہنا کہ فرقوں کی موجودگی سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا، مسلمان، فرقوں میں بٹنے کے باوجود سچے اور پکے مسلمان رہ سکتے ہیں، دین سے کتنی بڑی سرکشی اور خدا سے کیسی کھلی ہوئی بغاوت ہے؟ خدا کا ارشاد ہے کہ فرقہ بندی عذاب ہے، کفر ہے، شرک ہے اور ان حضرات کا کہنا ہے کہ نہیں! اختلاف خدا کی رحمت ہے۔ تفرقہ عین اسلام ہے۔ فرقے توحید پرستی کی علامت ہیں۔ سوچئے کہ کیا یہ قرآن کی کھلی ہو ئی تردید اور خدا کے خلاف اعلان جنگ نہیں؟

اکتیس (31) علماء کا مطالبہ:

ان حضرات کا کہنا ہے کہ 1951ء میں مختلف فرقوں کے اکتیس علماء اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک متفق علیہ آئین کا مطالبہ کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ مطالبہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ

(ا) مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ اور

(ب) شخصی معاملات (PERSONAL LAWS) میں، ہر فرقے کو، کتاب وسنت کی جداگانہ تعبیر کی آزادی دی جائے۔

شخصی قانون:

شق دوم کے متعلق میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کتاب یا سنت سے کوئی ثبوت بھی اس امر کا پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں شخصی معاملات اور غیر شخصی معاملات میں کسی قسم کی تمیز وتفریق ہو سکتی ہے۔ یہ ثنویت (DUALISM) یکسر غیر اسلامی اور دورِ ملوکیت کی ایجاد ہے جسے یہ حضرات اسلامی آئین کا جزو قرار دے رہے ہیں۔

شق دوم کے متعلق اس مختصر سے اشارے کے بعد شقِ اول (یعنی فرقہ بندی) کی طرف آیئے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے فرقوں کا وجود کفر وشرک ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن، فرقوں کے مٹانے کا طریق کیا بتاتا ہے؟

قرآن اختلاف مٹانے کے لئے آیا تھا:

یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ اس وقت ہماری حالت بعینہٖ ہی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی تھی۔ ان کے انبیاء نے انہیں ایک اُمت بنایا تھا لیکن انہوں باہمی ضد اور سرکشی سے فرقے پیدا کر لئے (42:14)۔ ان کے اختلافات مٹانے کے لئے قرآن نازل ہوا۔ چنانچہ سورہ نحل میں ہے: وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ۙ ۔۔۔ (16:64) اے رسول! ہم نے تیری طرف اس کتاب کو اس لئے نازل

کیا ہے کہ تو اِن باتوں کو سامنے ابھار کر لے آئے جن میں یہ ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہیں۔ اور خود مسلمانوں سے کہہ دیا کہ: وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ‌ؕ (42:10) جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ (یعنی اس کی کتاب) سے کرالیا کرو۔ اس سے ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ تمام دینی معاملات میں اختلافات مٹانے کا معیار بنے اور مسلمانوں کو امتِ واحدہ بنائے۔

قرآن میں اختلاف نہیں:

اس مقام پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اُس کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ جب صورتِ حالات یہ ہو تو پھر قرآن سے اختلاف کس طرح مٹائے جاسکتے ہیں؟ یہ سوال اہم ہے لیکن قرآن اس کا بھی جواب دیتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کا دعویٰ کہ: وَلَوۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ غَيۡرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوۡا فِيۡهِ اخۡتِلَافًا كَثِيۡرًا‏ ﴿۸۲﴾ (4:82) اگر قرآن خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلاف پائے جاتے۔ یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی (ایک) دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ قرآن (بہتر تو ایک طرف) دو فرقوں کے متضاد مسالک کی بھی تائید کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے کہ (قرآن بہتر فرقوں میں سے ہر ایک کے مسلک کی تائید کرتا ہے) تو وہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن وہ سوال ابھی اپنی جگہ پر باقی ہے کہ قرآن اس کا عملی طریق کیا بتاتا ہے کہ امت میں اختلافات پیدا ہی نہ ہوں اور اگر (بدقسمتی سے) اختلاف پیدا ہو جائے تو اُسے مٹایا کس طرح جائے؟ اس عملی حل کی تفاصیل اس کے مختلف مقامات میں برگِ لالہ وگل کی طرح بکھری پڑی ہیں لیکن اس نے ان تفاصیل کو سورہ آل عمران کی ایک آیت میں اس حسن وخوبی سے سمٹا دیا ہے کہ جوں جوں نگۂ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، روح وجد میں آجاتی ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رُو سے اختلاف سازی اور فرقہ بندی کفر ہے۔ وہ کہتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوۡا فَرِيۡقًا مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ يَرُدُّوۡكُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ كٰفِرِيۡنَ (3:100)

عملی طریق:

اے مسلمانو! اگر تم نے اہل کتاب کے کسی فرقے کی اطاعت کر لی، اگر اُس کی روش پر چل پڑے تو یاد رکھو۔ وہ تمہیں ایمان کے بعد، کفر کی طرف لوٹا دیں گے۔

اس کے بعد ہے۔

وَكَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ‌ؕ وَمَنۡ يَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ

---

❶ دیکھئے ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔

هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (3:101)

لیکن تم کس طرح کفر کر سکتے ہو؟ تم ایک امت بننے کے بعد، فرقوں میں کس طرح بٹ سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم وہ ہو کہ

(i) قوانین خداوندی تمہارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور

(ii) اس کا رسول تمہارے اندر موجود ہے۔

یاد رکھو۔ جو اس طرح سر رشتہء خداوندی کو محکم طور پر تھامے رکھے تو اس کی صحیح راستے کی طرف راہ نمائی ہوتی رہے گی۔

وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ :

اس سے واضح ہے کہ قرآن نے اُمت میں وحدت قائم رکھنے کے لئے دو چیزوں کا موجود رہنا ضروری بتایا۔ ایک کتاب اللہ اور دوسرا رسول۔ اس کے لئے اس نے مسلمانوں سے کہا کہ: فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (4:59) اگر تم میں کسی معاملہ میں تنازعہ ہو جائے تو اسے رسول کے پاس لے جاؤ، تا کہ وہ تمہیں بتائے کہ اس باب میں اللہ کا حکم کیا ہے۔ دوسری طرف رسول سے کہا کہ جب یہ اپنے اختلافی امور تمہارے پاس لائیں تو: فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔ اس کے بعد اگر کوئی تفرقہ پیدا کرے تو اُس سے کہہ دو کہ تمہارا اُس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ (6:160) جو لوگ دین میں تفرقہ پیدا کریں اور اس طرح ایک فرقہ بن کر بیٹھ جائیں، اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تیری امت سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ وہ مسلمان نہیں رہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد:

یہ تھا اُمت میں وحدت قائم رکھنے کا عملی طریق۔ یعنی رسول کی موجودگی جو اختلافی امور میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے دے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ رسول نے تو بہر حال اپنی عمرِ طبیعی کے بعد دنیا سے تشریف لے جانا تھا، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اُمت کی وحدت رسول اللہ ﷺ کی دنیاوی زندگی تک ہی رہ سکتی تھی۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اُمت کی وحدت، رسول اللہ ﷺ کی دنیاوی زندگی تک ہی رہ سکتی تھی، اس کے بعد اس کی کوئی صورت ہی نہ تھی؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں، تم بات کو صحیح طور پر سمجھے نہیں۔ یہ نظام رسول اللہ کی وفات کے ساتھ ختم نہیں ہو جائے گا۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ ۔۔۔(3:143) محمد بجز اِیں نیست کہ اللہ کے ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی کئی رسول ہو گزرے ہیں۔ تو کیا اگر وہ کل کو وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام ان کی زندگی تک محدود تھا، تم اپنی سابقہ روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ نظام بدستور قائم رہے گا۔ رسول ﷺ کی وفات کے بعد اس کا جانشین (خلیفہ) جو اُمت کے باہمی مشورہ سے منتخب ہوگا، اس کا قائم مقام بن جائے گا اور جو فرائض رسول (بہ حیثیت مرکز ملت) سرانجام دیتا تھا وہ فرائض اُس کا جانشین سرانجام دے گا۔ اس وقت تمام اختلافی امور کا فیصلہ، کتاب اللہ کی روشنی میں، خلیفۃ الرسولؐ کرے گا اور اس طرح وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ (3:101) کا عملی نظام قائم رہے گا۔ چنانچہ خلیفہء اول، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب مسلمانوں کے

ایک گروہ نے زکوٰۃ کے مسئلہ میں اختلاف کیا اور سمجھانے کے باوجود اپنے اختلاف پر قائم رہے تو ان کے خلاف جہاد کیا گیا اور اُمت کی وحدت میں فرق نہیں آنے دیا۔ اُس وقت اگر خلیفۃ الرسولؐ موجود نہ ہوتے تو اسی مسئلہ پر اُمت میں دو فرقے پیدا ہو جاتے۔

جب یہ نقشہ بگڑ گیا:

اُمت کی وحدت اُس وقت تک رہی جب تک وفیکم رسولہ کا یہ نقشہ قائم رہا۔ لیکن جب مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی تو سیاسی اقتدار، حکمرانوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شخصی معاملات (نکاح۔ طلاق وغیرہ سے متعلق مسائل) اربابِ مذہب کی تفویض میں آ گئے۔ امورِ مملکت میں اختلاف کرنے والا سلطنت کا باغی قرار پاتا تھا، اس لئے اس کی کسی کو جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ مذہب یتیم تھا اس لئے جس کا جی چاہتا اس میں اختلاف پیدا کر کے ایک نیا فرقہ بنا ڈالتا۔ وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ (3:101) کی آیت اُن کے سامنے تھی۔ لیکن اب اس کا مفہوم بدل گیا تھا۔ اب تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ کا مطلب تلاوت قرآن کریم لے لیا گیا۔ باقی رہا وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ تو اس کے لئے یہ سوچا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث اکٹھی کر لی جائیں اور اپنے اپنے طور پر ان پر عمل کر لیا جائے۔ اس طریق کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اُمت میں فرقے پیدا ہوتے۔ یہی مسلک اس وقت تک چلا آ رہا ہے، اور اسے عین دین سمجھ لیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ کا یہ مطلب نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُمت میں زندہ جانشینِ رسول کا موجود رہنا ضروری ہے جو مرکز ملت کی حیثیت سے دین کا عملی نظام قائم رکھے، تو شور مچا دیا جاتا ہے کہ یہ دین میں فتنہ ہے۔ ان کا شور مچانا تعجب انگیز نہیں۔ جب کوئی قوم عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ دے تو اس کے پاس شور مچانے کے علاوہ کوئی اور دلیل نہیں رہ جاتی۔ (بچے کے پاس یہی ایک حربہ ہوتا ہے جس سے وہ اپنا ہر مقصد پورا کرتا ہے)۔

خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا احیاء

بہرحال ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کی رُو سے اختلافات مٹانے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ اُمت میں ایک زندہ مرکز موجود ہو جو تمام اختلافی امور کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرے اور جو اس فیصلہ سے انحراف کرے اُسے ملت کے دائرہ سے باہر نکال دیا جائے۔ لہٰذا، اُمت کے لئے اب کرنے کا کام یہ ہے کہ جانشینیٔ رسول ﷺ کا جو سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اس کا دوبارہ احیاء کیا جائے۔ اسی کا نام خلافت علیٰ منہاج رسالت یا اسلامی مملکت کا قیام ہے۔ اس مملکت کا کام یہ ہوگا کہ جو کچھ ہمارے پاس دین کے نام سے چلا آ رہا ہے، قرآن کی روشنی میں اس کا جائزہ لے۔ جو کچھ اس کے مطابق ہو اسے برقرار رکھے۔ جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کر دے اور اس طرح بتدریج اُمت میں پھر اسی قسم کی وحدت پیدا کر دے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھی۔

سیاسی پارٹیاں:

یہ ہے برادرانِ عزیز اس سوال کا جواب کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی آئین کیسے بن سکتا ہے اور فرقوں کی موجودگی اسلام پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ جو کچھ قرآن نے مذہبی فرقوں کے متعلق کہا ہے وہی حکم سیاسی

پارٹیوں کے متعلق ہے۔ دین میں مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے نہیں ہوتے۔ اُمت میں تفرقہ بہرحال اسلام کے خلاف ہے خواہ وہ مذہبی فرقوں کی شکل میں ہو یا سیاسی پارٹیوں کی صورت میں، اسلامی مملکت میں مسلمانوں کی دو پارٹیاں ہو نہیں سکتیں۔

❁❁❁

اب مجھے صرف ایک نکتہ اور پیش کرنا ہے۔ جب آئینِ پاکستان کی تدوین کا مسئلہ زیرِ غور تھا تو ہم نے تجویز کیا تھا کہ آئین میں یہ شق ہونی چاہئیے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔ اس پر یہ کہا گیا کہ یہ سنتِ رسول اللہ ﷺ کے انکار ہے۔ آئین میں یہ شق رکھنی چاہئیے کہ پاکستان کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس فرق کو ذرا واضح طور پر بیان کردوں کیونکہ اسلامی آئین کے سلسلے میں یہ سوال پھر سامنے آئے گا۔ کسی معاملے کے متعلق اگر کوئی شخص قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کرے تو اس کے متعلق دنیا بھر کا کوئی مسلمان (خواہ وہ کسی فرقے سے متعلق کیوں نہ ہو) یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔ اس کے برعکس، حدیث کی کیا پوزیشن ہے، اس کے متعلق، کسی منکرِ حدیث سے نہیں بلکہ حدیث کو دینی حجت ماننے والوں کی زبان سے سنئیے۔ آئین سازی کے سلسلے میں اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے موجود ہیں، لائل پور سے شائع ہونے والا جریدہ المنبر اپنی 17 / 24 مارچ 1959ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

(مسلمانوں کے تمام) گروہ حدیثِ نبوی کو دینی حجت تسلیم کرتے ہیں اور اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ صحیح حدیث کے مقابلہ میں غیر رسول کی بات حجت نہیں۔ البتہ اختلاف یہاں آن کر رونما ہوتا ہے کہ فلاں حدیث کا انتساب رسولِ برحق ﷺ کی جانب درست ہے یا نہیں۔

یعنی اگر کسی معاملے کے متعلق کوئی شخص کسی حدیث کو پیش کرے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہو جائے گا کہ وہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی ہے بھی یا نہیں۔ ان حضرات کے نزدیک یہ سوال کچھ ایسا اہم نہیں جسے درخورِ اعتنا سمجھا جائے۔ حالانکہ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ دین کے معاملے میں اس سے بڑا اختلاف اور کوئی ہو نہیں سکتا کہ جس بات کو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی حیثیت سے پیش کیا جائے اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہے بھی یا نہیں۔ یہی چیز ہے جو اُمت میں تمام تفرقوں کا موجب ہے۔ ان حضرات کا قرآن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اس کی تفسیر احادیث کی روشنی میں کی جائے گی اور احادیث کی پوزیشن یہ ہے کہ ان کے معانی ومطالب ہی میں اختلاف نہیں بلکہ سرے سے اس بات میں اختلاف ہے کہ جس حدیث کو ایک شخص بطورِ سند پیش کر رہا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی ہے بھی یا نہیں۔ اگر مختلف فرقوں کے اکتیس علماء جو 1951ء میں جمع ہوئے تھے، کسی ایک کتاب کے متعلق یہ کہہ دیتے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ ہم سب کے نزدیک سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے، تو آئین میں قرآن کریم کے ساتھ اس کتاب کا نام بھی لکھ دیا جاتا۔ لیکن یہ بات نہ انہوں نے اس وقت کی، نہ ہی وہ قیامت تک کر سکتے ہیں۔ لہٰذا، ایک ایسی چیز کو آئینی طور پر قانون کی بنیاد قرار دینا جس کی پوزیشن یہ

---

❶ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہو جان بوجھ کر آئین کو نا قابلِ عمل بنانا نہیں تو اور کیا ہے؟ یاد رکھیئے، اسلامی مملکت کا وہی آئین قابلِ عمل ہوگا جس میں یہ درج ہو کہ مملکت کے فیصلوں کے لئے اصولی طور پر سند کتاب اللہ ہوگی اور کتاب اللہ کے علاوہ اور جو کچھ ہے اس کے متعلق یہ فیصلہ مملکت کرے گی کہ اس میں کون سی چیز صحیح ہے اور کونسی غلط اور یہ فیصلہ خود کتاب اللہ کی رُو سے ہوگا۔

❁❁❁

ایک مشورہ:

یہ ہے برادرانِ عزیز! میری بصیرتِ قرآنی کے مطابق اسلامی آئین اور اسلامی مملکت کی پوزیشن۔ میں کسی سے نہیں کہتا کہ وہ ان تصریحات کو بلا تحقیق صحیح تسلیم کر لے۔ ملک کے اربابِ حل وعقد سے میری گزارش یہ ہے کہ وہ ایسے حضرات پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کرے جن کی دینی بصیرت پر اعتماد ہو لیکن جن کا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہ ہو۔ وہ کمیشن قرآن کریم کی روشنی میں تمام متعلقہ امور کا جائزہ لے اور قطعی طور پر متعین کرے کہ اسلامک آئیڈیالوجی کسے کہتے ہیں۔ اسلامی آئین کے امتیازی خطوط کیا ہوتے ہیں، اور اسلامی مملکت کا منتہی و مقصود کیا۔ ایسے اہم مباحث کے متعلق اجتماعی طور پر کسی حتمی نتیجہ پر نہ پہنچنا اور انہیں انفرادی بحث ونظر کا موضوع بنائے رکھنا نہ صرف وقت، دولت اور توانائیوں کا ضیاع ہے بلکہ ایسے ذہنی انتشار کا موجب بھی جس کا لازمی نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے نو دس سال تک ہوتا رہا ہے اس سے قوم پر سخت مایوسی چھا چکی ہے۔ اگر اُسے انہی حالات کا پھر شکار ہونا پڑا تو اس کا نتیجہ جس قدر مضرت رساں ہوگا اس کا اندازہ اربابِ بصیرت بخوبی لگا سکتے ہیں۔

❁❁❁

رفیقانِ محترم! مجھے اس کا احساس ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا ہے، لیکن اس کا افسوس نہیں۔ اس لئے کہ یہ سوالات اس قدر اہم، اور جس دوراہے پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، وہ ایسا نازک ہے کہ اگر ہم نے اس باب میں ذرا سی بھی غفلت برتی تو نمعلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے ؎

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی مملکت نے اس کا فیصلہ کیا ہو کہ وہ اپنا آئین اسلامی خطوط پر پیش کرنا چاہتی ہے۔ آئین سازی کے پہلے دور نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ، ہم نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں اور دینی مملکت کیا ہوتی ہے؟ وہ دور خدا خدا کر کے ختم ہوا لیکن اب پھر وہی سوالات سامنے آ گئے۔

ایک بڑا خطرہ:

موجودہ اربابِ حل وعقد کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ اس باب میں ان کی نیتیں نیک ہیں لیکن ان کی دشواری یہ ہے کہ اسلامی آئین کا تصور ان کے سامنے بھی نہیں۔ ہمارے قدامت پسند طبقہ کی طرف سے اسلام کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے، اس

کے متعلق ان کا اندازہ ہے (اور بالکل ٹھیک اندازہ) کہ اس سے ہم دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ مجھے خدشہ یہ ہے کہ اس صورتِ حالات سے گھبرا کر وہ کہیں اس نتیجے پر نہ پہنچ جائیں کہ جس مذہب کی رُو سے ہزار برس میں یہ نہ طے ہو سکا کہ نماز میں ہاتھ سینے پر باندھنے چاہئیں یا زیر ناف۔ یا بالکل کھلے رکھنے چاہئیں، اُس مذہب کی رُو سے امورِ مملکت کس طرح طے پاسکیں گے۔ اور اس طرح وہ اربابِ شریعت سے کہہ دیں کہ

عمر بھر جی کے بھی جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا میرا میں باز آیا

وہ ان سے کہہ دیں کہ شخصی معاملات کو تم سنبھالو، امورِ مملکت کو ہم، باقی دنیا کی طرح، سیکولر انداز سے طے کرلیں گے۔ اگر خدا نکردہ ایسا ہو گیا تو نہ صرف یہ کہ مملکتِ پاکستان میں اسلام کے احیاء کی کوئی صورت باقی نہیں رہے گی بلکہ دیگر اسلامی ممالک بھی اس خیال کو ترک کر دیں گے۔ یہ ممالک، پاکستان کے اس تجربے کا کس شدت سے انتظار کر رہے ہیں، اس کا اندازہ مجھے لاء کمیشن کی رکنیت کے زمانے میں ہوا۔ ان ممالک کے کئی اربابِ فکر نے کہا کہ وہ دیکھ رہے ہیں پاکستان نے جس اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اس باب میں ہمارا پہلا تجربہ بھی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہم نے دوبارہ وہی کچھ کیا تو آپ سوچئے کہ دیگر مسلم ممالک پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اور غیر مسلم دنیا اسلام کے متعلق کس نتیجے پر پہنچے گی۔ اس سے آگے بڑھ کر میں بالخصوص اپنے ان احباب سے پوچھنا چاہتا ہوں جو طلوعِ اسلام کے مسلک سے متفق ہیں، کہ آپ فرمائیے کہ اگر خدا نکردہ ایسا ہو گیا تو آپ کی کیفیت کیا ہوگی؟ آپ موجودہ غیر قرآنی معاشرہ میں ان حسین اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کے سہارے جی رہے ہیں کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

لیکن اگر آپ کی غلفت اور کم ہمتی سے اس طلوعِ آفتاب میں تاخیر ہو گئی تو آپ کو اس کا کس قدر صدمہ ہوگا۔

شب ہجراں کے جاگنے والو
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

کرنے کا کام:

لہٰذا آپ سوچئے کہ اس وقت آپ پر کتنی عظیم ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری آپ سے کسی لمبی چوڑی قربانی کی بھی خواہاں نہیں۔ اس کا تقاضا فقط یہ ہے کہ آپ اسلامی آئین کے قرآنی تصور کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں۔ اس مقصد کے لئے آپ اپنی بے سروسامانی سے مت گھبرائیے۔ آپ کے دعوے کی صداقت، آپ کی نیتوں کا خلوص، آپ کے عزم کی پختگی، آپ کے عمل کی مداومت، آپ کے ذرائع کی کمی کو پورا کر دے گی۔ خدا کا کائناتی قانون آپ کی رفاقت کا تھوڑا سا سہارا چاہتا ہے۔ آپ اس سے ہم آہنگی پیدا کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے نتائج کس قدر تحیر انگیز برآمد ہوتے ہیں۔ اے ہمرہانِ نجستہ پا! قدم بڑھائیے۔ زمانہ آپ کا بڑی بیتابی سے انتظار کر رہا ہے۔

معمارِ حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز:

اسلام کے دانا دشمن، دانستہ، اور نادان دوست، نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے، لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دیتی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جا رہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتا دیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی، کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔

بمن وصالِ تو باور نمی کند غالبؔ
بیا کہ قاعدہء آسماں بگر دانیم

رفیقانِ محترم! میں نے اس وقت جو کچھ آپ سے کہنا تھا، اسے کہہ چکا۔ آخر میں میں اپنے قلبِ مضطرب کی انتہائی تپش و خلش کے ساتھ اس درخواست کو پھر دہراتا ہوں کہ آپ وقت کی آواز کو پہچانیں اور قرآنی فکر کے عام کرنے میں جو کچھ بن پڑے، کر گزریں۔ چہ عجب کہ آپ کی ان کوششوں سے ابن آدم کو اس کا وہ فردوسِ گم گشتہ پھر سے مل جائے جس کی تلاش میں وہ یوں مارا مارا پھر رہا ہے۔

بیا ایں خاکداں را گلستاں ساز
جہانِ پیر را دیگر جواں ساز
بیا یک ذرہ از دردِ دلم گیر
تہ گردوں بہشتِ جاوداں ساز

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

پرویزؔ

پانچویں نشست (بزمِ استفسارات)

20 اپریل (تین بجے بعد دوپہر) بزم استفسارات کے نام سے شرکائے کنوینشن کی خواہش کے تحت ہر کنوینشن میں اس بزم کا اجلاس ہوتا ہے۔ اجلاس کیا تمام مندوبین ومبصرین ضابطہ کی رسمیات سے آزاد ہو کر ایک نجی سی مجلس کی صورت میں گھر کی طرح یک جا ہو بیٹھتے ہیں۔ دین کے رموز وحقائق کو سوالات وجوابات کی صورت میں سمجھنے کے لئے یہ مجلس انتہائی سادگی کا رنگ لئے ہوتی ہے۔ نہ کوئی صدر اور نہ کوئی باضابطہ ایجنڈا۔ پرویزؔ صاحب ''میر مجلس'' کی طرح درمیان میں اور باقی سب ان کے گرداگرد دور تک پھیلے ہوئے۔۔ ماہ تاب کے گرداگرد ستاروں کا دل آویز ہالہ۔۔ پیر مغاں کے حلقہ میں رندانِ بلا نوش کا سرمستیوں میں ڈوبا ہوا ہجوم۔۔ سوال وجواب کا پُرکشش اور پُرکیف سلسلہ۔ پیر مغاں نے پکارا۔۔

بگیر ایں ہمہ سرمایہء بہار از من!

اور میکشوں نے دیوانہ وار اپنے ہاتھ ایک دوسرے سے آگے بڑھا دیئے۔ ساغر پہ ساغر لنڈھایا جا رہا تھا۔ متاعِ فقیر اس کے قافلے میں لٹائی جا رہی تھی۔ کتنے ہی اہم سوال صفحہء قرطاس پر بکھرے ہوئے آگے بڑھے اور ان عقدہ ہائے اسرار و رموز کی گرہ کشائی ہوتی چلی گئی۔ پیر مغاں کے حضور سے کوئی ہاتھ نامراد واپس نہیں لوٹا۔ اقبال نے شاید اسی منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرمغاں ہے مردِ خلیق

زندگی اور اس کے راز ہائے سربستہ، قرآن پاک کی آیاتِ دقیق، قانون طبیعات اور قانونِ مکافات کا رابطہ، مقامِ نبوت، کتنے ہی نکات تھے جو بے نقاب ہو کر سامنے آتے گئے۔ نہ میکشوں کی تشنگی کم ہونے میں آتی تھی اور نہ ساقیِ محفل کا دستِ فیض بخل سے کام لینا جانتا تھا۔ یہ بزم پُر نشاط کم و بیش ڈھائی گھنٹے جمی رہی اور پھر جب یہ محفل اٹھی، سب نے چائے کی میزوں کا رُخ کیا لیکن دلوں کی کیفیت یہ تھی کہ

مئے شبانہ کی مستی تو ہو چکی لیکن
کھٹک رہا تھا دلوں میں کرشمہء ساقی!

پرویزؔ کے فکر و بصیرت کی بارگاہِ ناز میں ہر سرِ نیاز جھکا جا رہا تھا۔

چھٹی نشست (درسِ قرآن)

20 اپریل (آٹھ بجے شب) مندوبین و مبصرین ابھی رات کے کھانے سے بمشکل فارغ ہوئے تھے، بعض خوش طبعی میں مصروف اور بعض سرگرم گلگشت تھے۔ خیال تھا کہ کھانے میں تاخیر کے باعث یہ مجلس کچھ دیر سے شروع ہوگی۔ لیکن میر کارواں پروگرام کی پابندی کا شدت سے قائل تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے انتہائی پُرسوز اور دلکش لے میں یہ روح نواز نغمہ فضاؤں میں گونجتا سنائی دیا۔

آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ ؐ است

محوِ خرام قدم اور کھانے کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔ چہکتی ہوئی زبانوں پر سکوت کی مُہریں لگ گئیں۔ محبوبِ حجازی کا ذکرِ جمیل، اور اقبال کے الفاظ میں سب کے قدم تیزی سے پنڈال کی طرف اُٹھ گئے۔ آناً فاناً سارا پنڈال بھر گیا۔ اقبال کی کوثر و تسنیم کی موجوں میں دُھلی ہوئی زبان سے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں نذرِ خلوص پیش ہو رہا تھا اور دیوانہ رسالت ﷺ پرویز کی چشمِ اشکبار سے گہر ہائے تابدار کا سلسلہ جاری تھا۔ ایوان کی فضا میں چاروں طرف جذب و مستی کا کیف برسنے لگا اور جب یہ دلکشا نغمہ ختم ہوا تو دل عجیب سرمستیوں میں ڈولے جا رہے تھے۔

عراق دل نشیں کا یہ ساز خاموش ہوا تو پرویزؔ صاحب نے سرور جانفزا سے انگڑائی لی۔ درس قرآن کے سلسلے میں سب کو

ان کے خطاب کا انتظار تھا۔ راولپنڈی کنونشن میں یہ اصرار ہوا کہ پرویزؔ صاحب نے قرآن کریم کا جو لغت مرتب کیا ہے، اس سے کچھ اوراق بطور نمونہ سامنے لائے جائیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس سے قرآن فہمی میں کیا مدد ملے گی۔ اس تقاضا کے پیش نظر پرویزؔ صاحب نے فیصلہ کیا کہ سورہ فاتحہ کے مفردات کے جو معانی اس لُغت کی رُو سے متعین ہوئے ہیں انہیں احباب کے سامنے پیش کیا جائے۔ لیکن وہ ابھی عربی زبان کی اہمیت اور خصوصیات کے تمہیدی بیان کے بعد سورہ ء فاتحہ کے ابتدائی الفاظ تک ہی آنے پائے کہ زور کی بارش آ گئی اور اُس محفل کو بصد حسرت ختم کرنا پڑا۔ اس مرتبہ شرکائے کنوینشن نے پھر اپنے تقاضا کا اعادہ کیا اور کہا کہ سورۃ الفاتحہ کے مفردات ہی کو درس کا موضوع بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں آغاز تقریر کرتے ہوئے پرویزؔ صاحب نے فرمایا۔

’’قرآن کی لُغت اور مفہوم کے سلسلے میں میری فکر انگیزیاں، عرق ریزیاں اور شب بیداریاں اب تکمیل کو پہنچنا چاہتی ہیں۔ لُغت مکمل ہو چکا اور اُس کا مفہوم بھی (لغات اور مفہوم القرآن)۔ اب صرف ان کی طباعت باقی ہے۔ اس لُغت کے تعارف سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ یہ قرآن کو سمجھانے میں کس قدر ممد و معاون ثابت ہو گی۔‘‘

’’میں تمہیداً یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قُرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ کتاب آسان ہے اور ہمارا اس دعوے پر ایمان ہے۔ خود قرآن عربی کے معنی لغوی طور پر واضح قرآن کے ہیں۔ قرآن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ سمجھنے کے لئے بڑا آسان ہے لیکن جس طرح خارجی اثرات اور وقت کی رفتار سے الفاظ کے مفہوم بدل جاتے ہیں اسی طرح قرآن کے الفاظ کا مفہوم بھی ان ثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔‘‘

پرویزؔ صاحب نے اس سلسلے میں بعض الفاظ کی مثالیں پیش کیں اور کہا کہ یہ وہ صورت تھی جس کی بنا پر آیات قرآنی کے مفہوم کے سلسلے میں مجھے عربی کی مختلف لغاتوں سے کام لینا پڑا اور الفاظ کے مادوں سے قرآن کریم کے مختلف مقامات کی روشنی میں، ان کا مفہوم مرتب کرنا پڑا۔ ازاں بعد پرویزؔ صاحب نے سورہ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کا مفہوم عربی زبان کی مستند لغتوں سے بالتفصیل واضح کیا۔ اس تفصیل کی روشنی میں سورہ فاتحہ کے ہر لفظ کا مفہوم انسانی فکر کے لئے اس قدر عظیم دعوتِ انقلاب نظر آیا کہ حاضرین عش عش کر اُٹھے۔ اور لغوی طور پر ہر لفظ کا مفہوم واضح کرتے ہوئے جب انہوں بحیثیت مجموعی سورہ فاتحہ کا ترجمہ پیش کیا تو مروجہ بے روح ترجموں کے مقابلے میں ان وجد آفریں معانی و مطالب پر ہر شخص جھوم اٹھا۔ پرویزؔ صاحب اس بیان سے گواہی دے رہے تھے کہ اگر کتاب اللہ کو علم و فکر کی اس بلند بینی سے پیش کیا جاتا تو آج پوری نوع انسانی اس چشمہ ءنور سے مالا مال ہو رہی ہوتی۔ اور انسانی زندگی میں ایسی فصل بہار کا سماں بندھ چکا ہوتا جس کی شادابیاں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ تین گھنٹے کے بعد، کتاب اللہ کی عظمت سے معمور دل لے کر جب یہ محفل برخاست ہوئی تو سب کی روحوں پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔

ساتویں نشست (یوم اقبال کی تقریب)

21/اپریل (9 بجے صبح) ’’یوم اقبال‘‘ کی نسبت سے عالم اسلام کے اس حکیم عظیم اور مفکرِ جلیل کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اس سہانی مجلس کا انعقاد ہوا۔ تمام پنڈال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پرویزؔ صاحب نے آغاز خطاب

کرتے ہوئے کہا۔

''طلوعِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے اُس قلبی تعلق سے بخوبی آگاہ ہیں جو مجھے حضرت علامہ کی ذات سے تھا۔ لیکن شاید اُس عقیدت واحترام کا اندازہ نہ لگایا جاسکے جو اُن کے لئے میرے دل کی گہرائیوں میں موجزن ہے اوران کا وہ احسانِ عظیم جس سے میرگردن جھکی جارہی ہے، یہ تھا کہ انہوں نے مجھے قرآن سمجھنے کے قابل بنایا۔ یہ قرآن تھا جس نے آدمی کو ''مقامِ آدم'' سے روشناس کرایا۔ اُس نے یہ حقیقتِ عظیم قصہءِ آدم میں حسن انداز کے تمثیلی رنگ میں بیان کی اور پھر اقبالؔ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی تفسیر کی۔ آج کی مجلس میں، میں اقبالؔ کے اس پیغام کوقرآن کی روشنی میں بیان کروں گا کہ ۔۔ آدم کیا ہے؟ وحی کی روشنی نے اسے کیا سمجھایا اور کیا سے کیا بنا دیا۔ اور پھر اقبالؔ نے اپنے ڈرامائی انداز میں اس حقیقت کی نقاب کشائی کس طرح کی''۔

اس مرحلے پر پرویزؔ صاحب کے اندازِ خطابت کا رُخ بدل گیا۔ وہ قرآن کی روشنی اور اقبال کی زبان سے والہانہ ڈرامائی انداز میں مقامِ آدم کی نقاب کشائی کررہے تھے۔ پنڈال کے طول وعرض میں بے مثال خاموشی کا دور دورہ تھا اور جذب ومستی کی سلسبیل دلوں میں دوڑ رہی تھی ۔۔ آدم کون تھا؟ اس کی زندگی کا آغاز کیونکہ ہوا؟ اس نے کس حسنِ انداز سے جہانِ نو کی طرح ڈالی؟ اُس کی جہانگیریوں اور عالم آرائیوں کا سلسلہءِ دراز کہاں سے کہاں تک پہنچا؟ چمنستانِ حیات میں اُس نے کیا کیا گل کھلائے اور کیا کیا بوقلمیاں کیں؟ وحی کی راہ نمائی کے بغیر وہ کس طرح يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ‌ۚ (2:30) کا پیکر بنا اور پھر وحی کی روشنی نے اسے کس طرح ہر قسم کے خوف حزن سے نجات دلائی۔ قرآن کی روشنی اقبالؔ کی زبان اور پرویزؔ کا حسنِ بیان ۔۔ گویا موسمِ بہار میں ابرِ بہار جھوم جھوم کر اٹھا۔ جھوم جھوم کر برسا اور قلب ونظر کی کشتِ نو بہار کی شادابیوں میں ایسا نکھار پیدا کرگیا جس پر فصلِ گل ہمیشہ ناز کرے گی۔ جب قریب دو گھنٹے کے بعد اس ''آسمانی ڈرامہ'' کا آخری سین ''ندائے جمال'' کے بلاوے پر آدم کے اس جواب پر ختم ہوا کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

تو ہر قلب یہ محسوس کررہا تھا گویا وہ آسمان کی بلندیوں کی سیر کرنے کے بعد پھر اس خاکدانِ ارضی پر واپس آ گیا ہے۔ اوراس پیشکش کے متعلق ہر شخص کی زبان پر تھا کہ

آفاقہا گردیدہ ام ، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام ، اما تو چیزے دیگری

الوداعی نشست

کھانے کے بعد، کاروانِ عشق ومستی کے یہ افراد، کشاں کشاں پنڈال کی طرف آ گئے تا کہ رخصت ہونے سے پہلے، اپنے محبوب دل نواز سے الوداعی پیغام حاصل کرلیں۔ کنوینشن کی نشست ہمیشہ مختصر لیکن اثر ودرد کی شدتوں میں ڈوبی ہوئی

ہوتی ہے۔احباب کے دل میں اس کا اثر فرداً فرداً ہوتا ہے۔لیکن پرویزؒ صاحب پر اس کا مجموعی اثر ہوتا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس رخصتی کے وقت ان کے دلِ پُرحسرت پر کیا گزرتی ہے۔ وہ مائک پر آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اوران کے سامنے احباب میں سے بھی کسی کی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔وہ خطیبِ سحر بیاں، جو مشکل سے مشکل موضوع پر گھنٹوں مسلسل اور بے تکان بولتا چلا جاتا ہے، مائک پر ساکت وصامت کھڑا تھا۔ہجومِ جذبات نے اس کے دل کو طلسمِ پیچ وتاب بنا رکھا تھا۔اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا۔۔اس نے بصد مشکل لب کشائی کی اور جب آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں احباب سے کہا کہ

حیرت کے غم کدہ میں خوشی کی گزر کہاں
تم آگئے تو رونق کاشانہ ہو گئی

تو پنڈال کے مختلف گوشوں سے ہچکیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔انہوں نے اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا کہ آپ احباب قرآن کا پیغام سننے کے لئے یہاں جمع ہوئے۔اب اس پیغام کو لے کر اپنے اپنے مقام پر واپس جایئے اور اسے ان لوگوں تک پہنچایئے جن تک ابھی یہ نہیں پہنچ سکا۔لیکن ایسا کرتے وقت، اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھئے کہ قرآن کے پیغام میں اپنے ذاتی میلانات ورجحانات اور خیالات وتصورات کی ذرا سی بھی آمیزش نہ ہونے پائے۔خدا کے پیغام میں انسانی خیالات کی آمیزش شرکِ عظیم ہے جس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

دوسری اہم چیز یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ آپ کے کردار وگفتار سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ بندی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔فرقہ بندی بھی قرآن کی رُو سے شرک ہے جس سے اجتناب اشد ضروری ہے۔

تیسری بات یہ کہ میں جو کچھ قرآن کے متعلق کہتا ہوں وہ میرا فہم قرآن ہے اور کسی انسان کا فہم قرآن حرف آخر نہیں ہو سکتا۔میری تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصود یہ ہے کہ آپ حضرات براہ راست قرآنِ کریم پر غور وتدبر کریں اور اسے خود سمجھنے کی کوشش کریں۔قرآن ہر شخص کو دعوتِ فکر وتدبر دیتا ہے۔

اس مختصر لیکن جامع پیغام کے بعد انہوں نے حسبِ سابق یہ کہہ کر احباب کو رخصت کیا کہ

وداع ووصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا!

اس پیغام کے خاتمے پر، تمام احباب، اس شمعِ قرآنی کے گرد پروانہ وار جمع ہو گئے اور قلوب کی تلاطم خیزیوں اور آنکھوں کی شبنم فشانیوں کے ساتھ ایک ایک دوست اپنے حبیبِ صادق کے گلے مِل کر رخصت ہوا۔اس، کیف و درد سے پُر منظر کی یاد، آیندہ اجتماع تک، احباب کے دلوں میں شمع نورانی بن کر جگمگاتی رہے گی۔

8-مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9-مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین' اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے' حرکت وعمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10-مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح ومناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین' اسے وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب وزینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے' جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے(القرآن)۔

12-مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13-مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلاعلم ودلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل وتدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14-مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)' سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جا سکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15-مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
08

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam